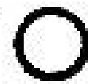
باب ۳۴

پرویز اپنے عروج کی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اس کی عظیم سلطنت بحیرۂ اسود سے لے کر صحرائے نوبا اور کوہ البرز سے لے کر شمالی پنجاب تک پھیلی ہوئی تھی۔ اپنے پرانے دارالسلطنت مدائن کے ساتھ اس کی زندگی کی چند تلخ داستانیں وابستہ تھیں۔ اور وہ اس پُررونق شہر کو اپنے لیے منحوس خیال کرتا تھا۔ چنانچہ آرمینیا، شام اور فلسطین میں اپنی فتوحات کے پرچم گاڑنے کے بعد اس نے دجلہ کے پار، مدائن سے کوئی ساٹھ میل شمال کی طرف اپنے لیے ایک نئے دارالحکومت کی تعمیر شروع کر دی تھی۔ اس نئے شہر کا نام دست گرد تھا اور کسریٰ نے مفتوحہ ممالک کے مالِ غنیمت اور باجگزار ریاستوں کے خراج سے جو خزانے جمع کیے تھے وہ دست گرد کی تعمیر پر صرف ہو رہے تھے۔ اس کے پاس ان قیدیوں کی کمی نہ تھی جو فنِ تعمیر میں طیبہ، بابلیون، روم، ایتھنز اور بعلبک کی عظمتِ رفتہ کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان قیدیوں کے خون پسینے اور آنسوؤں اور ان کے لٹے ہوئے شہروں کی دولت سے کج کلاہِ ایران اپنے لیے وہ عظیم عشرت کدہ تعمیر کر رہا تھا جس کے سامنے پرسی پولس اور مدائن کے محل بے حقیقت نظر آتے تھے۔ دست گرد کے عظیم محل کی وسعت، دلکشی اور رعنائی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ سنگِ مرمر کے چالیس ہزار ستون جو سونے چاندی اور ہاتھی دانت سے مزین تھے، اس کی چھتوں کو سہارا دے رہے تھے۔ دیواروں کے ساتھ تیس ہزار تصویریں آویزاں تھیں۔ بڑے گنبد کی چھت کے ساتھ ایک ہزار سنہری فانوس جھلملاتے تھے۔ تہ خانے کے ایک سو کمرے صرف قیمتی لباس اور سونے، چاندی اور جواہرات کے خزانوں کے لیے مخصوص تھے۔ اس محل کی چار دیواری کے اندر بارہ ہزار غلام اور خدمت گار موجود تھے اور تین ہزار وہ حسین و جمیل لونڈیاں تھیں جنہیں مفتوحہ ممالک سے جمع کیا گیا تھا۔ محل سے باہر چھ ہزار مسلح سوار ہر وقت پہرہ دیتے تھے۔ شاہی رعب و جلال کی نمائش کے لیے نو سو ساٹھ ہاتھیوں

سے کام لیا جاتا تھا۔ اردگرد میلوں تک زرخیز زمین کو باغات اور شکارگاہوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اور ان وسیع شکارگاہوں میں انواع واقسام کے وہ پرندے اور جانور جمع کیے گئے تھے جن کے شکار سے پرویز کبھی کبھی اپنا جی بہلایا کرتا تھا۔ ایران کا مغرور اور عیاش حکمران جب کبھی دست گرد سے باہر نکلتا تھا تو اس کے سفر کا سامان بارہ ہزار اونٹوں پر لادا جاتا تھا۔

غرض ایران کے اس نئے دارالحکومت یا ایرانی حکمران کے اس بے مثال عشرت کدے کے اندر اور باہر وہ سب کچھ موجود تھا جس کی ایک جابر حکمران کو تمنا ہو سکتی تھی۔ اور جو ایک مظلوم اور بے بس رعایا اسے دے سکتی تھی۔ قصر شاہی سے باہر دست گرد کی بیشتر آبادی محفوظ فوج کے سپاہیوں اور حکومت کے عہدے داروں پر مشتمل تھی۔ اور کسریٰ اس نئے دارالحکومت میں اپنے آپ کو ان بااثر امراء اور مجوسی کاہنوں کی سازشوں سے محفوظ پاتا تھا۔ جو مدائن کے عوام کو اپنا آلۂ کار بنا کر حکومت کا تختہ الٹ دیا کرتے تھے۔ اس کے دل و دماغ پر اپنے باپ کے عبرتناک انجام کا یہ اثر تھا کہ وہ دنیا کے کسی انسان کو یہاں تک کہ اپنے بیٹوں کو بھی قابل اعتماد نہیں سمجھتا تھا۔ حکومت کے انتہائی بااختیار افسر یا فوج کے بڑے بڑے جرنیل ایک دن اس کے دربار میں عزت کی کرسیوں پر رونق افروز دکھائی دیتے اور اگلے دن کسی ادنیٰ جاسوس کی شکایت پر قید خانے کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں پہنچ جاتے۔ ایک دن ایک خوشامدی اپنی چرب زبانی کے بل بوتے پر اپنے حریفوں کو پچھاڑتا ہوا درباریوں کی اگلی صف میں جا کھڑا ہوتا اور اگلے دن اسے کسی بڑے خوشامدی اور زیادہ چرب زبان کے لیے اپنی جگہ خالی کرنا پڑتی۔ غرض دست گرد کے امراء، کاہن اور اہل کار ایک دوسرے کے خلاف بقا کی جنگ لڑ رہے تھے۔ اور پرویز جو صرف ان لوگوں کے اتحاد کو اپنے لیے خطرناک سمجھتا تھا پوری آزادی اور اطمینان کے ساتھ ان پر حکومت کر رہا تھا۔



ایک شام سین اور عاصم اپنے رومی ساتھیوں کو دست گرد کے شاہی مہمان خانے میں چھوڑ کر کسریٰ کی محافظ فوج کے سپہ سالار تورج کی قیام گاہ میں داخل ہوئے۔ تورج سین کے ان پرانے دوستوں میں سے

تھا جنھوں نے مصائب کے دور میں کسریٰ کا ساتھ دیا تھا۔ اس نے گرمجوشی سے بغل گیر ہو کر سین کا خیر مقدم کیا اور پھر کسی توقف کے بغیر ایک ہی سانس میں کئی سوال کر دیئے: "آپ کیسے آئے؟ آپ محاذ جنگ کے متعلق یقیناً کوئی اہم خبر لائے ہوں گے۔ آپ کچھ پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں شہنشاہ نے آپ کو واپس تو نہیں بلا لیا؟"

سین نے جواب دیا: "میں ایک ضروری کام سے آیا ہوں اور کسی تاخیر کے بغیر شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔"

تورج، سین کا ہاتھ پکڑ کر ایک کشادہ کمرے میں لے گیا اور عاصم ان کے پیچھے ہو لیا۔ وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے اور تورج نے کہا: "میں ابھی محل کے داروغہ کو اطلاع بھجوا دیتا ہوں۔ لیکن اگر آپ محاذ جنگ سے کوئی بری اطلاع لے کر آئے ہیں تو میں آپ کو رات کے وقت انھیں پریشان کرنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ اس وقت وہ رقاصاؤں، گویوں اور نقالوں کے ساتھ جی بہلا رہے ہوں گے۔"

سین نے جواب دیا: "اس وقت میں بھی آرام کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ محل کے داروغہ کو صبح کے وقت اطلاع دینا زیادہ موزوں ہو گا۔"

تورج نے سوال کیا: "آپ نے محاذ جنگ کے متعلق کچھ نہیں بتایا؟"

"میں محاذِ جنگ کے متعلق کوئی نئی خبر لے کر نہیں آیا۔ ابھی تک آبنائے باسفورس ہمارے لشکر اور قسطنطنیہ کے درمیان حائل ہے۔"

"تو پھر آپ کی آمد میرے لیے ایک معما ہے۔ آپ اپنی مرضی سے تشریف لائے ہیں یا کسریٰ نے آپ کو حاضری کا حکم بھیجا تھا؟"

"میں اپنی مرضی سے آیا ہوں۔"

"معاف کیجیے میں آپ کے ساتھی کو پہچان نہیں سکا۔ یہ کون ہیں؟" تورج نے عاصم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

"یہ ایک عرب ہیں۔ اور ان کا نام عاصم ہے۔ شام، فلسطین اور مصر کی جنگوں میں ہمارا ساتھ دے

بچکے ہیں۔ اور میں ان کی دوستی پر فخر کرسکتا ہوں۔"

تورج نے کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ آپ کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آئے۔"

عاصم نے کہا: "میں قیصرِ روم کی طرف سے صلح اور دوستی کی پیشکش لے کر آیا ہوں ـــــ اس کے ایلچی مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور کسریٰ کے ساتھ ان کی ملاقات کے بعد دستگرد میں میرا کام ختم ہوجائے گا۔"

تورج کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ وہ کچھ دیر ایک سکتے کے عالم میں عاصم کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "قیصر کے ایلچی مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور آپ نے انھیں شہنشاہ کے سامنے پیش کرنے کی ذمہ داری قبول کی ہے؟"

"جی ہاں میں انھیں اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔"

"میں اس سے بڑی حماقت کا تصور نہیں کرسکتا۔"

سین نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر یہ حماقت ہے تو اس کے نتائج میری ذات تک محدود رہیں گے۔ میں کسی دوست کو اپنے جرم میں حصہ دار نہیں بناؤں گا۔ آپ یہ بھول جائیں کہ میں نے آپ سے قیصر کے ایلچیوں کا ذکر کیا ہے۔"

"لیکن شاہی مہمان خانے میں انھیں کیسے جگہ مل گئی؟"

"آپ پریشان نہ ہوں۔ شاہی مہمان خانے کے منتظمین نے انھیں صرف تاجروں کے بھیس میں دیکھا ہے اور جو تاجر کسریٰ کے لیے تحائف لے کر آتے ہیں۔ ان کے متعلق زیادہ چھان بین نہیں کی جاتی۔"

"اور آپ کسریٰ کو یہ اطلاع دینا چاہتے ہیں کہ یہ تاجر درحقیقت قیصر کے ایلچی ہیں؟"

"ہاں اور آپ کی تسلی کے لیے میں اپنی مہم کی تمام تفصیلات بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ آپ میرے رازدار ہیں۔ میں اپنے عزیز ترین دوست کو ان معاملات سے الگ تھلگ رکھنا چاہتا ہوں۔"

"بہت اچھا سنائیے۔ شاید اس کے بعد میں آپ کو کوئی نیک مشورہ دے سکوں۔"

سین نے مختصراً قیصر کے ساتھ اپنی ملاقات کی روداد بیان کردی۔ لیکن احتیاطاً اس سارے قصے سے عاصم کا تذکرہ حذف کردیا اور اس کی جگہ قیصر کے ایک ایلچی کا نام لے دیا۔

جب اس نے اپنی روداد ختم کی تو تورج کچھ دیر بے حس و حرکت بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا: "سین اگر میں اس وقت خواب نہیں دیکھ رہا اور تم واقعی میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہو ـــــ اگر قیصر کا کوئی ایلچی تمھارے پاس تھا اور قیصر سے تمھاری ملاقات ہوئی تھی اور اگر تم مجھے اپنا دوست اور خیرخواہ سمجھتے ہو تو میرا مشورہ ہے کہ تم جس راستے سے یہاں آئے ہو اسی راستے واپس چلے جاؤ۔ میں بھی تمھاری طرح جنگ جاری رکھنے کے حق میں نہیں ہوں۔ ہم قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لیے جتنے سپاہیوں کی قربانی دیں گے وہ ہمارے لیے کئی اور ملک فتح کرسکتے ہیں، لیکن کسریٰ کے سامنے امن اور صلح کی تجاویز پیش کرنا ایک حماقت ہے۔ کاش تمھیں یہ معلوم ہوتا کہ اس میں کتنی تبدیلی آچکی ہے۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف کوئی نصیحت یا مشورہ سننا پسند نہیں کرتا ـــــ یہاں اجازت کے بغیر تمھاری آمد بھی اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگی۔"

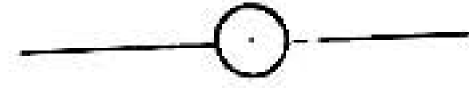
سین نے اٹھتے ہوئے جواب دیا: "مجھے افسوس ہے کہ میں نے یہاں آکر آپ کو پریشان کیا۔ میں اب آپ کو تکلیف دینے کی بجائے مہمان خانے میں قیام کروں گا۔ اور یہ بات کسی پر ظاہر نہیں ہو گی کہ میں یہاں آیا تھا۔ لیکن کسریٰ کے پاس ضرور جاؤں گا۔"

تورج زخم خوردہ سا ہو کر اٹھا اور سین کا ہاتھ پکڑ کر اسے زبردستی کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولا: "میرے دوست! میرا یہ مطلب نہ تھا تم میرے پاس ٹھہرو گے ـــــ اور میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ سمجھتے ہوئے بھی تمھاری تائید کروں گا کہ تم غلطی کررہے ہو۔"

عاصم نے جواب دیا ـــــ "نہیں، ہم صرف اس شرط پر آپ کے پاس ٹھہریں گے کہ آپ اس معاملے سے بے تعلق رہیں۔"

"اگر تمھاری خوشی اسی بات میں ہے تو مجھے یہ شرط منظور ہے۔"

تھوڑی دیر بعد یہ لوگ ایک پُر تکلف دسترخوان پر بیٹھے ہوئے تھے اور تورج اپنے دوست کے ساتھ اس زمانے کی باتیں کر رہا تھا جب انھوں نے پرویز کے ساتھ فرار ہو کر روم کے ایک سرحدی قلعے میں پناہ لی تھی۔



اگلے دن سین شاہی ایوان کے ایک کشادہ کمرے میں اپنے فرمانروا کی مسند کے سامنے کھڑا تھا پرویز کے دائیں ہاتھ دو حسین و جمیل لونڈیاں سونے کی صراحی اور ساغر اٹھائے کھڑی تھیں۔ محل کا ناظم چند اہل کار اور مسلح سپاہی سین سے چند قدم پیچھے دروازے کے قریب کھڑے تھے پرویز نے کچھ دیر اپنی سفاک نگاہوں سے سین کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے دائیں طرف دیکھ کر ہاتھ سے اشارہ کیا اور ایک لونڈی نے سنہری طشت جس میں ارغوانی شراب کا ساغر چھلک رہا تھا، آگے بڑھا دیا۔ پرویز نے جواہرات سے مرصع ساغر اٹھا کر شراب کے چند گھونٹ پیئے اور اسے دوبارہ طشت میں رکھتے ہوئے سین کی طرف متوجہ ہوا۔

"جہاں تک ہمیں علم ہے تمھیں قسطنطنیہ فتح کرنے سے پہلے اپنا محاذ چھوڑنے کی اجازت نہ تھی اگر ہماری حکم عدولی کی وجہ یہ ہے کہ تم کوئی خوشی کی خبر لائے ہو تو تمھیں کل یہاں پہنچتے ہی ہمارے سامنے پیش ہونا چاہیے تھا۔"

سین نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "عالیجاہ! یہ غلام آپ کی حکم عدولی کا خیال بھی اپنے دل میں نہیں لا سکتا۔ میں ایک اہم خبر لایا ہوں۔ میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ میرا کسی تاخیر کے بغیر حضور کی قدم بوسی کیلئے حاضر ہونا ضروری ہے۔"

پرویز نے کہا۔ "قسطنطنیہ کی فتح کے سوا ہمارے لیے کوئی اور خبر اہم نہیں ہو سکتی۔"

"عالیجاہ! میں شرمسار ہوں کہ میں قسطنطنیہ کی فتح کا مژدہ لے کر نہیں آیا۔ لیکن میں آپ کو یہ خوشخبری دے سکتا ہوں کہ ہم نے جس مقصد کے لیے تلوار اٹھائی تھی وہ حاصل ہو چکا ہے۔ قیصر ہار مان چکا ہے اور وہ مزید تباہی سے بچنے کے لیے ہماری ہر شرط ماننے کے لیے تیار ہے۔ اگر اس کے لیے دست گرد کا راستہ مسدود نہ ہوتا تو وہ بذاتِ خود یہاں پہنچ کر آپ سے صلح کی بھیک مانگتا۔

کسریٰ کی حالت اس درندے کی سی تھی جو زخم کھانے کے بعد گہری نیند سے بیدار ہوا ہو۔ اس نے

بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "ہم نے تمھیں قیصر کو پابہ زنجیر یہاں لانے کا حکم دیا تھا اور تم اس کے ایلچی بن کر آ گئے ہو — تمھیں یہ جرأت کیسے ہوئی؟"

"عالیجاہ! میں کئی سال کی ناکام کوششوں کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہم آبنائے باسفورس کا پانی ایرانی سپاہیوں کے خون سے سرخ کیے بغیر قسطنطنیہ پر قبضہ نہیں کر سکتے۔ اگر اس جنگ کا مقصد ایران کا لوہا منوانا ہے تو ہمیں یہ مقصد حاصل ہو چکا ہے۔ اگر قیصر ایران کے ایک ادنیٰ باجگزار کی حیثیت سے آپ کی پناہ میں آ جائے اور اسے آپ کی شرائط منظور ہوں جو کسی شکست خوردہ دشمن کی شہ رگ پر تلوار رکھ کر منوائی جا سکتی ہے تو مجھے ایسی جنگ جاری رکھنے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا جس کے نتائج کے متعلق سرِ دست کوئی بات پورے یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی — رومیوں کی موجودہ بے بسی کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شمال مغربی سرحدوں پر وحشی قبائل نے تباہی اور بربادی کا ایک طوفان بپا کر رکھا ہے اور وہ ہلاکت سے بچنے کیلئے ہماری پناہ میں آنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ وحشی ہمیشہ کے لیے ان کے دشمن بنے رہیں۔ قیصر ہم سے مایوس ہو کر ان کی طرف دیکھے گا اور یہ ممکن ہے کہ کسی دن وہ آپس میں صلح کر لیں اور ہمیں ان کی متحدہ قوت کا سامنا کرنا پڑے۔ شاید آپ کو یہ علم نہ ہو کہ ایرج جو خاقان کے پاس دوستی کا پیغام لے کر گیا تھا۔ ان کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔"

کسریٰ نے اضطراب کی حالت میں ساقی کے طشت سے شراب کا جام اٹھایا اور جلدی سے خالی کرنے کے بعد کہا۔ "یہ ناممکن ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا، خاقان میں یہ جرأت نہیں ہو سکتی۔"

"عالیجاہ! اگر آپ کو یقین نہیں آتا۔ تو میں اس شخص کو آپ کے سامنے پیش کر سکتا ہوں جس نے اپنی آنکھوں سے اسے قتل ہوتے دیکھا تھا۔"

"تم یہ سمجھتے ہو کہ ایرج کے قتل کی خبر سن کر ہم مرعوب ہو جائیں گے؟"

"نہیں عالیجاہ! میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ رومی اگر ہماری شرائط مان لیں تو ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے لیکن تاتار کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔"

پرویز نے سوال کیا۔ "تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ ہرقل ہماری تمام شرائط مان لے گا؟"

"عالیجاہ ہرقل کے ایلچی حضور کی قدم بوسی کے لیے یہاں پہنچ چکے ہیں اور وہ صلح کی شرائط طے کرنے

کے لیے مکمل اختیارات لے کر آئے ہیں۔"

کسریٰ کی رگوں کا سارا خون سمٹ کر اس کے چہرے میں آ گیا اور اس نے غصے اور اضطراب سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "وہ کس طرح یہاں پہنچ گئے — وہ کہاں ہیں؟"

سین نے اطمینان سے جواب دیا "عالیجاہ! وہ میرے ساتھ آئے ہیں اور شاہی مہمان خانے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

کسریٰ کی نگاہیں سین سے ہٹ کر اس سے چند قدم پیچھے محل کے داروغہ پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ لرزتا ہوا آگے بڑھا اور سراپا التجا بن کر چلایا۔ "عالیجاہ! میں بے قصور ہوں۔ مہمان خانے کے ناظم نے مجھے صرف یہ بتایا تھا کہ سپہ سالار کے ساتھ چند متمول تاجر آئے ہیں اور وہ جہاں پناہ کو تحائف پیش کرنا چاہتے ہیں۔"

کسریٰ کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔ وہ کچھ دیر بے حس بیٹھا سین کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے سوال کیا۔ "تم کب سے قیصر کے ساتھ صلح کی بات کر رہے تھے اور تمہارے پاس اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اسے ہماری ہر شرط قبول ہو گی۔"

"عالیجاہ! اگر صرف قیصر کے ایلچی میرے پاس آتے تو میں انہیں منہ لگانے کی جرأت نہ کرتا — میں اس لیے یہاں حاضر ہوا ہوں کہ قیصر بذات خود آپ کے اس ادنیٰ غلام کے پاس حاضر ہوا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں نے اس کا پیغام آپ تک پہنچانے میں کوتاہی کی تو آپ شاید مجھے قابل معافی نہیں سمجھیں گے۔"

کسریٰ اٹھ کر کھڑا ہو گیا — ساقی نے جلدی سے آگے بڑھ کر شراب کا جام پیش کیا۔ لیکن اس نے غصے سے ہاتھ مارا اور سنہری جام چند قدم دور جا گرا۔ چند ثانیے بعد وہ دوبارہ مسند پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "ہرقل تمہارے پاس آیا تھا؟"

"ہاں عالیجاہ! میں جھوٹ نہیں کہتا۔ میری روانگی سے تین دن قبل سمندر کے کنارے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔"

"جب وہ تمہارے پاس آیا تھا تو ہماری فوج کہاں تھی؟"

"فوج پڑاؤ میں تھی عالیجاہ! اور ہماری ملاقات پڑاؤ سے کچھ دور سمندر کے کنارے ہوئی تھی۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے ہرقل کے ساتھ پہلے سے خفیہ ملاقات کا انتظام کر رکھا تھا۔"

"عالیجاہ! میں نے اس کے ایلچیوں کے ساتھ ملاقات کرنا قبول کیا تھا اور ہرقل کو اس ملاقات کے بعد یہ

ن آنا تھا۔ لیکن وہ انتظار نہ کر سکا اور رات کے وقت جب اس کے ایلچی میرے پاس پہنچے تو ہرقل ان کے ساتھ تھا۔"

"اور تم اسے گرفتار نہ کر سکے۔ تمہیں ہمارا یہ حکم یاد نہ رہا کہ ہم اسے پابہ زنجیر دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"عالیجاہ! وہ اپنے ہتھیار پھینک کر میرے پاس آیا تھا اور میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان حالات میں آپ اس کی گرفتاری پسند فرمائیں گے۔"

"اسے یہ اطمینان تھا کہ تم اسے گرفتار نہیں کرو گے؟"

"عالیجاہ! وہ یہ جانتا تھا کہ میں ایک شہنشاہ کا خادم ہوں اور میرا شہنشاہ ایک گرے ہوئے دشمن پر ہاتھ اٹھانا پسند نہیں کرے گا۔"

"تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ ایک عیسائی عورت کے شوہر سے اسے کوئی خطرہ نہیں تھا — تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہرقل کی محبت نے تمہیں ہمارا غدار بنا دیا تھا —"

"عالیجاہ!"

"خاموش، تم ہمیں دھوکا نہیں دے سکتے۔ ہم جانتے ہیں کہ قسطنطنیہ اب تک صرف تمہاری غداری کے باعث فتح نہیں ہوا۔ تم ابتدا سے اس جنگ کے مخالف تھے۔ ہم نے مقدس کاہنوں کے مشورے کے خلاف تم پر اعتماد کیا اور تم نے ہمیں رعایا کے سامنے شرمسار کیا۔ اب تم واپس جا کر ہمارے دشمن سے اس غداری کا صلہ حاصل نہیں کر سکو گے۔"

سین نے سراپا التجا بن کر کہا۔ "عالیجاہ! میں غدار نہیں ہوں۔ میرے بال آپ کی خدمت میں سفید ہوئے ہیں۔ میں نے دشمن کے کئی شہروں اور کئی قلعوں پر آپ کی فتوحات کے پرچم نصب کیے ہیں۔"

"خاموش!" پرویز بلند آواز میں چلایا۔ "اس غدار کو یہاں سے لے جاؤ۔ اس کی کھال اتار دو اور لاش مغربی دروازے سے باہر لٹکا دو اور دشمن کے جو جاسوس اس کے ساتھ آئے ہیں انہیں حراست میں لے لو۔"

سین سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ کسریٰ کے سامنے پیش ہوتے وقت اسے یہ خدشہ ضرور تھا کہ وہ ٹھنڈے دل سے صلح اور امن کی باتیں نہیں سنے گا۔ اپنی مہم کی ناکامی کی صورت میں وہ اپنے عہدے سے معزول ہونے کے بعد قید یا نظر بند ہونے کے لیے بھی تیار ہو کر آیا تھا۔ تاہم یہ امید اس کا آخری سہارا تھی کہ پرویز کا غصہ عارضی ثابت ہو گا۔ اور جب جنگ کی طوالت سے اکتائے ہوئے فوجی مشیر اور مصاحب

اس کی تائید میں آواز بلند کریں گے تو وہ اس کی بیڑیاں اتارنے پر مجبور ہو جائے گا۔ بدترین حالات میں بھی ایک وحشیانہ موت کی سزا اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ وہ پرویز کی طرف اس بچے کی طرح دیکھ رہا تھا جسے طمانچہ کھانے کے بعد پیار کی توقع ہو۔ سپاہی، داروغہ اور دوسرے افسر جو وہاں موجود تھے دم بخود ہو کر کبھی سین اور کبھی پرویز کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اگر کسی اور کا معاملہ ہوتا تو وہ اس پر بھوکے درندوں کی طرح جھپٹ پڑتے لیکن ایرانی لشکر کا ایک بہادر جرنیل اور پرویز کے بچپن کا دوست اس بے بسی کی حالت میں بھی عام انسانوں سے مختلف دکھائی دیتا تھا۔

پرویز کے لیے یہ صورتِ حال غیر متوقع تھی۔ وہ چلایا۔ "دیکھتے کیا ہو، اسے لے جاؤ۔"

وہ آگے بڑھے۔ داروغہ نے سین کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔ "چلیے!"

اور سین نے اچانک ایسا محسوس کیا کہ اس پر چاروں اطراف سے آگ کے دہکتے ہوئے انگاروں کی بارش ہو رہی ہے اس نے داروغہ کا ہاتھ جھٹک دیا اور بلند آواز میں چلایا۔ "ہرمز کے بیٹے! میں تمھارا اس وقت کا ساتھی ہوں جب اس دنیا میں تمھارے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ تم میری کھال اتروا سکتے ہو۔ میری بوٹیاں نوچ سکتے ہو لیکن مجھے یہ کہنے سے نہیں روک سکتے کہ تم ظالم ہو اور تمھارا انجام تمھارے باپ سے مختلف نہیں ہوگا —— تم ان کے دشمن اور انسانیت کے قاتل ہو اور مجھے مرتے وقت اس بات کا افسوس ہوگا کہ میں تمھارے مظالم میں شریک تھا میں اس یقین کے ساتھ مروں گا کہ میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر چکا ہوں۔ اور تم اس خوف اور اضطراب کے ساتھ زندہ رہو گے کہ زندگی کا ہر سانس تمھیں ایک عبرتناک تباہی کی طرف لے جا رہا ہے اور مرتے وقت تمھاری چیخیں میری سسکیوں سے زیادہ دردناک ہوں گی۔ میں مستقبل کے افق پر ان آندھیوں کے آثار دیکھ رہا ہوں جو تمھاری سلطنت کو خس و خاشاک کی طرح اڑا لے جائیں گی —— قانونِ قدرت میں ہر ظالم کی سزا کا دن معین ہے اور تمھاری سزا کا دن دور نہیں۔"

جس طرح سین کے لیے ایک وحشیانہ سزا کا حکم غیر متوقع تھا۔ اسی طرح سین کی یہ تقریر پرویز کے لیے غیر متوقع تھی۔ اس کا غصہ، اضطراب اور اضطراب خوف میں تبدیل ہو رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کیلئے اجنبی بن چکے تھے۔ اور وہ جو اسے گرفتار کرنے کے لیے آگے بڑھے تھے تذبذب کی حالت میں کبھی ایک اور کبھی دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پرویز جس کی قوت گویائی تھوڑی دیر کے لیے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک کپکپی لینے کے بعد چلایا۔ "اسے لے جاؤ —— اسے لے جاؤ اور ہمیں کسی تاخیر کے بغیر اطلاع دی جائے کہ ہمارے حکم کی تعمیل ہو چکی ہے۔"

آن کی آن میں سپاہیوں کی ننگی تلواریں سین کے بدن کو چھو رہی تھیں لیکن وہ اپنے گرد و پیش سے بے پروا ہو کر پرویز کی طرف دیکھ رہا تھا اور مغرور بادشاہ کو اس کی نگاہیں اس کے الفاظ سے زیادہ خوفناک محسوس ہوتی تھیں۔ داروغہ نے سین کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا لیکن اس مرتبہ اس نے مزاحمت کی ضرورت محسوس نہ کی وہ مڑا اور ننگی تلواروں کے پہرے میں لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

پرویز کے دماغ میں ابھی تک سین کے الفاظ گونج رہے تھے اس نے اپنا بھاری تاج اتار کر ایک لونڈی کے حوالے کیا اور کچھ دیر سر پکڑ کر بیٹھا رہا پھر اچانک چلانے لگا۔ "ہمیں شراب دو۔ ہمیں اتنی شراب دو کہ ہم زندگی کے سارے غم بھول جائیں —— ہمیں یہ خاموشی پسند نہیں یہاں رقص و سرود کی محفل آراستہ کرو۔ اور شراب کے دریا بہا دو ——"

اور قریباً ایک ساعت بعد جب رقص و سرود کی یہ محفل اپنے شباب پر تھی، تورج بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ رقصاؤں کے جمگھٹ سے گزر کر مسند کے قریب پہنچتے ہوئے بولا۔ "عالیجاہ! میں اس گستاخی کے لیے معذرت چاہتا ہوں لیکن شہر میں کہرام مچا ہوا ہے اور میرے لیے یہ بات ناقابل یقین ہے کہ آپ سین کی موت کا حکم دے چکے ہیں۔"

پرویز نے مدہوشی کے عالم میں اس کی طرف دیکھا اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے اپنا جام اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ لو!"

تورج نے شراب کا جام اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ "عالیجاہ! میں سین کیلئے رحم کی التجا لے کر آیا ہوں۔"

"وہ غدار ابھی تک زندہ ہے؟"

"عالیجاہ آپ اس کی جان بچا سکتے ہیں۔"

"اس کی جان اب کوئی نہیں بچا سکتا۔ تم یہاں بیٹھ جاؤ!"

"عالیجاہ!"

"بیٹھ جاؤ! یہ ہمارا حکم ہے اور تم جانتے ہو کہ ہماری حکم عدولی کی سزا کیا ہو سکتی ہے۔"

تورج انتہائی اضطراب کی حالت میں مسند سے کچھ دور بائیں طرف ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور پرویز نے کچھ دیر خاموشی سے اس کی طرف گھور گھور کر دیکھنے کے بعد کہا: "تمہیں ہماری شراب پسند نہیں؟"

تورج نے جلدی سے شراب کا جام خالی کرنے کے بعد کہا: "عالیجاہ! سین آپ کا جاں نثار ہے"

پرویز نے جھلا کر کہا: "یہ ابھی تک سین کا ذکر کر رہا ہے اسے اور شراب دو۔"

ایک لونڈی نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنی صراحی سے تورج کا خالی جام بھر دیا اور اس نے بادلِ ناخواستہ چند اور گھونٹ پی لیے۔

پرویز نے کہا: "ہم تمہیں سین کی جگہ قسطنطنیہ کی مہم پر بھیج رہے ہیں لیکن یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں۔ تم جی بھر کر شراب پیو۔ پھر تمہیں سین کا خیال نہیں ستائے گا ——— تمہیں یہ رقص پسند نہیں آیا؟"

"مجھے یہ رقص بے حد پسند ہے عالیجاہ!" تورج نے یہ کہہ کر شراب کا جام دوبارہ منہ کو لگا لیا اور اسے خالی کرنے کے بعد ساقی کی طرف بڑھا دیا۔

تیسرا جام حلق سے اتارنے کے بعد تورج کا رنج و اضطراب دور ہو چکا تھا۔ لونڈی چوتھی مرتبہ اس کا جام بھرنے کے لیے آگے بڑھی تو تورج نے اس کے ہاتھ سے صراحی چھین لی اور یکے بعد دیگرے دو اور جام بھر کر خالی کر دیئے۔ اس عرصہ میں ایک اور لونڈی پرویز کو ایک نیا جام پیش کر چکی تھی۔ پرویز نے چند گھونٹ پینے کے بعد خمار آلود نگاہوں سے تورج کی طرف دیکھا اور کہا: "تم ہمارے پاس ایک غدار کے لیے رحم کی درخواست لیکر آئے تھے!"

"نہیں عالیجاہ!" اس نے شکست خوردہ لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن تم یہ کہتے تھے کہ شہر میں کہرام مچا ہوا تھا۔"

ایک ثانیہ کے لیے تورج کے دماغ سے شراب کا نشہ اتر گیا اور اس نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

"نہیں عالیجاہ! آپ کی رعایا کسی غدار کے حق میں آواز بلند کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی۔"

"ہمیں صرف اس بات کا افسوس ہے کہ ہمارے کانوں تک اس غدار کی چیخیں نہیں پہنچ سکتیں

لیکن معلوم ہے کہ اس نے ہمیں دھمکیاں دی ہیں؟"

"نہیں عالیجاہ! اگر میں یہاں موجود ہوتا تو اسے زبان کھولنے کا موقع نہ دیتا۔"

"تمہیں ایسے موقعوں پر غیر حاضر نہیں رہنا چاہیے۔ تم کہاں تھے؟"

"عالیجاہ! اگر مجھے یہ علم نہ ہوتا کہ اس کے ساتھ آپ کی ملاقات تخلیہ میں ہوگی تو میں یقیناً یہاں موجود ہوتا۔"

"اب تمہیں ہمارا یہ حکم ہے کہ اگر دستگرد میں اس کا کوئی حامی نظر آئے تو اسے کسی تاخیر کے بغیر تختۂ دار پر لٹکا دو۔"

"عالیجاہ! میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا لیکن مجھے یقین ہے کہ دستگرد میں کوئی انسان آپ کے غدار کا حامی نہیں ہو سکتا۔"

پرویز نے کہا: "یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ دستگرد مدائن سے دور ہے اور وہاں سے ہمارے دشمن اس طرف کا رُخ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اس طرف اگر مدائن کی ساری آبادی امڈ آئے تو صرف ہمارے ہاتھی انہیں کچل دینے کے لیے کافی ہوں گے۔"

"عالیجاہ! آپ کے نام کی ہیبت مسلح افواج اور ہاتھیوں سے کہیں زیادہ ہے۔"

کسریٰ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا: "کسی زمانے میں تم گایا کرتے تھے اور ہمیں تمہارا ایک گیت بہت پسند تھا۔"

"ہاں عالیجاہ! جب ہم نے رومیوں کے ایک سرحدی قلعے میں پناہ لی تھی تو آپ مجھ سے اکثر وہ گیت سنا کرتے تھے"

"ہم آج پھر وہ گیت سننا چاہتے ہیں۔"

"لیکن عالیجاہ! اب مجھے گانا نہیں آتا۔"

"ہم تمہیں حکم دیتے ہیں۔"

"عالیجاہ! میں آپ کے حکم کی تعمیل سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ گیت سین نے لکھا تھا۔"

پرویز نے تلملا کر کہا۔ "ہمارے سامنے اس کا نام نہ لو۔ وہ جس نے یہ گیت لکھا تھا ہمارا بچپن کا ساتھی تھا اور وہ جسے ہم نے آج موت کی سزا دی ہے ایک غدار ہے ——— تم گاؤ ——— رقص بند کر دو۔"

تورج مذبذب سا ہو کر رقاصاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔ پرویز چلایا: "یہ رقص بند کر دو۔"

رقاصائیں رقص بند کر کے ایک طرف ہٹ گئیں اور تورج نے اپنی مغموم آواز میں گیت شروع

کیا۔ پردوں کے پیچھے سے اس کی بے جان لَے کے ساتھ طاؤس و رباب کی تانیں بلند ہونے لگیں۔ تورج کے گیت کا مفہوم یہ تھا:

"ہم بے سروسامانی کی حالت میں مدائن سے نکلے ہیں۔
لیکن ہم اپنی فتوحات کے پرچم لہراتے ہوئے واپس آئیں گے۔
اور ایران کی تاریخ ہمارے خون سے لکھی جائے گی۔
بہرام ایک غاصب ہے اور پرویز ہمارا شہنشاہ ہے۔
نوشیرواں کا تاج صرف پرویز کے سر پر زیب دیتا ہے۔
اور ساسانیوں کی عظمت صرف اس کے دم سے قائم ہے۔
دجلہ اور فرات کی لہریں گواہ ہیں کہ ہم پرویز کے جاں نثار ہیں۔
اور روئے زمین کی آخری حد تک اس کا ساتھ دیں گے۔
ہم مدائن کے اُجڑے ہوئے ایوانوں کو دوبارہ آباد کریں گے۔
ہم اپنے خون اور آنسوؤں سے ایران کے مقدر کی سیاہی دھو دیں گے۔
ہم اپنی ہڈیوں سے پرویز کے نئے قلعے تعمیر کریں گے۔
اور ہم دنیا بھر کے تاج نوچ کر اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیں گے۔"

تورج کی آواز اس کے قابو میں نہ تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور وہ پرویز کی نگاہوں سے بچنے کے لیے سر جھکائے ہوئے تھا۔ اس نے گیت ختم کرتے شراب کا ایک جام بھرا اور منہ کو لگایا۔ آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے اس کی آنکھوں سے ٹپکے اور شراب کے جام میں جا گرے۔

پرویز بولا۔ "تورج! آج ہمیں تمہارا گیت پسند نہیں آیا۔ تمہاری آواز تمہاری صورت سے زیادہ بھونڈی ہے۔"

تورج نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔ "عالیجاہ! مجھے اس بات کا احساس تھا کہ میری آواز آپ کو پسند نہیں آئے گی۔ میں نے صرف آپ کے حکم کی تعمیل کی تھی۔"

پرویز رقاصاؤں کی طرف متوجہ ہوا "تم کیا دیکھ رہی ہو ـــ ؟ گاؤ! ناچو! ـــ"

رقاصاؤں اور مغنیوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور تھوڑی دیر بعد جب یہ محفل اپنے شباب پر تھی، محل کا داروغہ جھکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور آگے بڑھ کر سہمی ہوئی آواز میں بولا۔ "عالیجاہ! آپ کے حکم کی تعمیل ہو چکی ہے۔"

محفل پر یکایک سناٹا طاری ہو گیا۔ رقاصائیں دم بخود ہو کر شہنشاہ کی طرف دیکھنے لگیں۔ پرویز چند ثانیے داروغہ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اس نے شراب سے لبالب جام اپنے منہ کو لگا لیا اور ارغوانی شراب کی دھاریں اس کی باچھوں سے نکل کر اس کی قبا کو داغدار کرنے لگیں۔ پھر اس نے خالی جام دیوار کے ساتھ دے مارا اور کہا "اس نے لوگوں کے سامنے ہماری توہین کی ہو گی۔ تمہیں کھال اتارنے سے پہلے اس کی زبان نوچ لینی چاہیے تھی۔"

"عالیجاہ! ہم نے اسے زیادہ دیر چیخنے کا موقع نہیں دیا۔"

"اس نے ہمارے متعلق کیا کہا تھا۔"

"کچھ نہیں عالیجاہ! مرتے وقت اس کی دماغی حالت ٹھیک نہ تھی۔"

پرویز نے جھنجلا کر کہا۔ "ہم یہ سننا چاہتے ہیں کہ اس نے کیا کہا تھا۔؟"

"عالیجاہ وہ یہ کہتا تھا کہ عرب کے کسی نبی کی پیش گوئی پوری ہونے کا وقت آ گیا ہے۔"

"ہم تمہارا مطلب نہیں سمجھے؟"

"عالیجاہ! وہ یہ کہتا تھا کہ عرب کے نبی کی پیش گوئی کے مطابق رومی عنقریب ہم پر غالب آئیں گے۔ ایران میں ظلم کے پرچم سرنگوں ہو جائیں گے اور دستگرد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی عالیجاہ! ہمارا خیال تھا کہ وہ جان دیتے وقت بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرے گا لیکن موت کے خوف سے وہ ایک دیوانے کی طرح چلا رہا تھا۔ جو لوگ اس کی چیخ و پکار سن کر وہاں جمع ہو گئے تھے انہیں اس کی غداری کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہا۔"

"اس نے ہمارے متعلق اور کیا کہا تھا ـــ؟"

"عالیجاہ! میں اس کے الفاظ دہرانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

پرویز غضب ناک ہو کر چلّایا: "ہم تمھیں حکم دیتے ہیں۔"

"عالیجاہ! وہ یہ کہتا تھا کہ مجھے اپنی موت کا افسوس نہیں۔ بلکہ اس بات کا افسوس ہے کہ میں نے اپنی ساری زندگی ایک ظالم کی خدمت میں بسر کی ہے۔ آج میں اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا ہوں۔ لیکن مجھے یہ اطمینان ہے کہ میرے قاتل کا انجام مجھ سے زیادہ عبرتناک ہوگا۔۔۔ اس نے لوگوں کو بغاوت پر اکسانے کے لیے یہ بھی کہا تھا کہ ایران اپنے ظالم حکمران کی ہوسِ ملک گیری کی تسکین کیلئے ان گنت قربانیاں دے چکا ہے اور اگر تمھارے نزدیک اپنے بیٹوں اور بھائیوں کے خون کی کوئی قیمت ہے تو تمھارے لیے صلح اور امن کا دروازہ کھلا ہے۔ ورنہ میں وہ وقت دیکھ رہا ہوں جب ایران کی رگوں سے خون کا آخری قطرہ بہہ چکا ہوگا۔ تم رحم کی بھیک مانگو گے۔ لیکن تمھاری التجائیں ٹھکرا دی جائیں گی۔۔۔ عالیجاہ! یہ ممکن تھا کہ چند احمق اس کی باتوں سے گمراہ ہو جاتے لیکن ہم نے اسے زیادہ دیر بکنے کا موقع نہیں دیا۔"

پرویز نے پوچھا۔ "وہ عرب کا نبی کون ہے جس نے ہمارے متعلق پیش گوئی کی ہے؟"

"عالیجاہ! مجھے معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ سین نے لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے یہ بات کہی ہوگی۔ عرب کی کوئی طاقت نہیں۔ قبائل ہمارے حلیف ہیں اور جب تک یمن پر ہمارا قبضہ ہے عرب کے کسی بھی کے لوگ بھی ایک ایسے نبی کے ساتھ تعاون کی جرأت نہیں کریں گے جو حضور کے متعلق اس قسم کی پیشگوئیاں کرتا ہو۔"

"ہرقل کے ایلچی ایک غدار کے انجام کو دیکھ کر بھاگ تو نہیں گئے؟"

"عالیجاہ! انھیں شاید ابھی تک یہ پتا نہیں چلا کہ سین اپنے جرم کی سزا بھگت چکا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ابھی تک مہمان خانے میں اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک عرب ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ گزشتہ رات اس نے مہمان خانے کی بجائے سین کے ساتھ تورج کے ہاں قیام کیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اس کے متعلق کچھ جانتے ہوں۔"

پرویز تورج کی طرف متوجہ ہوا اور اس کے دماغ سے اچانک شراب کا نشہ اتر گیا۔

"عالیجاہ!" اس نے عاجز ہو کر کہا۔ "میں نے سین کو حضور کا ایک وفادار خادم سمجھ کر اپنے ہاں ٹھہرایا تھا اور یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ وہ ایک غدار بن چکا ہے اور اس عرب

کے متعلق بھی مجھے سین کی زبانی یہی معلوم ہوا تھا کہ وہ فلسطین اور مصر کے معرکوں میں ہمارا ساتھ دے چکا ہے۔ سین نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ حبشہ کی مہم میں حصہ لینے والے عرب رضاکاروں کا سالار تھا۔ عالیجاہ! ایسے آدمی کے لیے آپ کا ایک جاں نثار اپنے گھر کا دروازہ بند نہیں کر سکتا تھا۔"

پرویز نے کہا۔ "ہم نے یروشلم کی جنگ کے ایام میں ایک عرب نوجوان کو سین کے ہمراہ دیکھا تھا اور شاید ہم نے اسے انعام بھی دیا تھا۔ اگر یہ وہی ہے تو اسے بھاگنے کا موقع نہیں ملنا چاہیئے۔ ہم کسی مناسب وقت پر اس سے ملاقات کریں گے ممکن ہے کہ ہمیں سین کی سازشوں کے متعلق مزید معلومات حاصل ہو سکیں۔ اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے گرفتار کر لو۔"

تورج نے پہلی بار قدرے جرأت سے کام لیتے ہوئے سوال کیا۔ "عالیجاہ! قیصر کے ایلچیوں کے متعلق آپ کا کیا حکم ہے؟"

"اس وقت ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ سر دست ہمارا یہی حکم ہے کہ ان میں سے کسی کو بھاگنے کا موقع نہیں ملنا چاہیئے۔ آج تم ایک غدار کا انجام دیکھ چکے ہو۔۔۔ کل ہمیں یہ اطلاع نہیں ملنی چاہیئے کہ اس کے ساتھی تمھاری آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہو چکے ہیں۔"

تورج کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پرویز کی چہیتی ملکہ اچانک عقب کے دروازے کا پردہ اٹھا کر کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے مسند کے قریب پہنچ کر تحکمانہ انداز میں کہا۔ "شہنشاہ عالی تبار کو تخلیے کی ضرورت ہے۔"

حاضرینِ مجلس پریشانی کی حالت میں کبھی پرویز اور کبھی ملکہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پرویز نے اضطراب کی حالت میں ملکہ کی طرف دیکھا لیکن اس کی نگاہوں کا احتجاج ملکۂ شیریں کو متاثر نہ کر سکا۔ وہ قدرے برہم ہو کر چلائی۔ "تم نے سنا نہیں کہ عالم پناہ کو تخلیے کی ضرورت ہے۔"

حاضرین یکے بعد دیگرے وہاں سے کھسکنے لگے اور آن کی آن میں کمرہ خالی ہو گیا۔

ملکہ نے کرب انگیز لہجے میں سوال کیا۔ "عالم پناہ! کیا یہ درست ہے کہ آپ سین کو موت کی سزا دے چکے ہیں؟"

پرویز نے آزردہ ہو کر جواب دیا۔ "ملکہ بیٹھ جاؤ، ہمیں پریشان نہ کرو۔۔۔"

"تو یہ درست ہے۔"

"ہاں یہ درست ہے لیکن ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ گستاخ کون ہے جو اس وقت تمہارے آرام میں مخل ہوا ہے۔"

ایران کی ملکہ ایسی باتوں سے بے خبر نہیں رہ سکتی۔ میرے محل کے دروازے ان لوگوں کے لیے بند نہیں ہوسکتے جو یہ محسوس کر کے میری طرف دوڑتے ہیں کہ میں ان کے حکمران کو کسی غلطی سے روک سکتی ہوں۔ عالیجاہ! مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ سین جیسے جاں نثار کی موت کا حکم دے سکتے ہیں۔"

"ملکہ تم اس غدار کے متعلق کچھ نہیں جانتیں۔ جب تمہیں سارے حالات معلوم ہوں گے تو تمہیں یہ اطمینان ہو جائے گا کہ سین کے متعلق ہمارا فیصلہ درست تھا لیکن اس وقت بحث سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہمارے حکم کی تعمیل ہو چکی ہے۔"

"میں صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میرے شوہر کو دوست اور دشمن کی تمیز نہیں رہی۔"

"ہمیں پریشان نہ کرو شیریں، ہمیں آرام کی ضرورت ہے۔" پرویز یہ کہہ کر مسند سے اٹھا اور عقب کے کمرے کی طرف چل دیا اور شیریں کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

باب ۴۵

جس وقت محل کا داروغہ پرویز کو سین کی موت کی اطلاع دے رہا تھا، کلاڈیوس اور عاصم شاہی مہمان خانے کے دروازے پر کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے اور سائمن اور ولیریس بے چینی کی حالت میں چند قدم دور مہمان خانے کے کشادہ صحن میں ٹہل رہے تھے۔

کلاڈیوس نے کہا۔ "عاصم! انہیں بہت دیر ہو گئی۔ میں بہت پریشان ہوں۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اس وقت کسریٰ کے دربار میں کیا ہو رہا!"

عاصم نے جواب دیا۔ "پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ وہ بچپن کے دوست ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کسریٰ نے اُسے کھانے کے لیے روک لیا ہوگا۔"

"لیکن انہوں نے کہا تھا کہ اگر شہنشاہ کا طرزِ عمل حوصلہ افزا ہوا تو میں یہ کوشش کروں گا کہ تمہیں آج ہی بلا لیا جائے۔"

عاصم نے کہا۔ "دن کے وقت کسریٰ کی محفلیں اتنی طویل نہیں ہوتیں۔ ممکن ہے کہ سین وہاں سے فارغ ہونے کے بعد تورج کے پاس چلے گئے ہوں۔ کاش میں تمہارے پاس آنے کی بجائے وہیں ٹھہر کر ان کا انتظار کرتا!"

"تورج ان کے ساتھ نہیں گیا تھا؟"

"نہیں، تورج کو شہر سے باہر فوج کے پڑاؤ میں کچھ کام تھا۔ اُس نے سین سے یہ کہا تھا کہ میں واپسی پر مہمان خانے میں تمہارے ساتھیوں سے ملاقات کروں گا۔ اب ممکن ہے کہ وہ شہنشاہ کے دربار میں چلا گیا ہو اور وہیں سے سین کو اپنے ساتھ لے کر گھر پہنچ گیا ہو۔"

"لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر کوئی اچھی خبر ہوتی تو وہ ہمارے پاس ضرور آتے۔"

عاصم نے کہا۔ "میں تورج کے ہاں جا کر پتا کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہاں میرے لیے کوئی اطلاع آئی ہو۔ ان کا گھر شہر کی دوسری طرف ہے۔ میں گھوڑے پر جاتا ہوں!"

"میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔" کلاڈیوس یہ کہہ کر عاصم کے ساتھ اصطبل کی طرف چل دیا۔ صحن سے گزرتے ہوئے وہ سائمن اور ولیریس کے قریب رکے اور عاصم نے کہا۔ "ہم تورج کے گھر جا رہے ہیں ممکن ہے کہ وہ شہنشاہ سے ملاقات کے بعد وہاں پہنچ گئے ہوں۔"

سائمن نے کہا۔ "عام حالات میں سین کو سیدھا ہمارے پاس آنا چاہیئے تھا۔ میرے خیال میں ہمیں اِدھر اُدھر بھاگنے کی بجائے یہیں ان کا انتظار کرنا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ ابھی تک ان کی ملاقات جاری ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ابھی تک محل کے دروازے پر کھڑے اذنِ باریابی کے منتظر ہوں۔ میں اس مہمان خانے میں کئی بادشاہوں کے ایلچی دیکھ چکا ہوں جو کئی کئی ہفتوں اور مہینوں سے ملاقات کے لیے کسریٰ کے حکم کا انتظار کر رہے ہیں۔"

عاصم کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اچانک ایک سرپٹ سوار صحن میں داخل ہوا۔ اور وہ مضطرب سے ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

یہ سوار سین کے ان سپاہیوں میں سے ایک تھا۔ جو شہر سے باہر لشکر کے پڑاؤ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ عاصم اور اس کے ساتھیوں کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے کود پڑا اور چلایا۔ "آپ نے سپہ سالار کے متعلق کچھ سنا؟"

وہ اضطراب کی حالت میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ بالآخر عاصم نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"تمہاری صورت بتا رہی ہے کہ تم کوئی اچھی خبر نہیں لائے۔"

سپاہی نے کرب انگیز لہجے میں کہا۔ "وہ مر چکے ہیں!"

وہ دیر تک سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر اچانک عاصم نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ سپاہی کے کندھے پر رکھ دیئے اور اسے بیدردی کے ساتھ جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "تم جھوٹ کہتے ہو۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ تم پڑاؤ میں تھے اور وہ کسریٰ کے پاس گئے ہوئے تھے۔ پڑاؤ میں ان کی موت کی افواہ کسی دشمن نے اڑائی ہو گی؟"

سپاہی کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا "کاش! یہ خبر غلط ہوتی۔ جب پڑاؤ میں کہرام مچا ہوا تھا تو ہم بھی یہی سمجھتے تھے کہ یہ خبر غلط ہے لیکن میں شہر کے ایک چوراہے میں ان کی لاش دیکھ چکا ہوں۔"

عاصم نے ایک ڈوبتے ہوئے انسان کی طرح تنکوں کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ "تمہیں یقین ہے کہ تمہاری آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا؟"

"میں نے جو لاش دیکھی ہے اسے پہچاننا ناممکن ہے۔ وہ کھال کے بغیر تھی اور گدھ اسے نوچ رہے تھے لیکن وہاں جمع ہونے والے لوگ چلا رہے تھے کہ یہ سین کی لاش ہے۔ سین کے چند دیرینہ دوست جنہیں میں جانتا ہوں، وہاں موجود تھے اور وہ رو رہے تھے۔ میں ان سے تمام واقعات پوچھ کر آیا ہوں۔ میں اس جلاد سے بھی مل چکا ہوں جسے زندہ ان کی کھال اتارنے کا حکم دیا گیا تھا۔ فوج کے ایک افسر نے مجھے ان کے کپڑے بھی دکھائے تھے۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ میں ان کے ساتھ آیا ہوں تو وہ میرے گرد جمع ہو گئے۔ وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ سین شہنشاہ کا غدار کیسے بن گیا۔ اگر وہ بغاوت پر آمادہ ہو چکا تھا تو یہاں کیوں آیا تھا؟ کیا یہ درست ہے کہ وہ قیصر کے ساتھ مل گیا تھا — مجھے معلوم نہیں کہ میں نے جنون کی حالت میں کیا کچھ کہہ ڈالا۔ پاس ہی ایک کاہن لوگوں کو یہ سمجھا رہا تھا کہ اگر ایران کے لشکر کی قیادت اس غدار کو نہ سونپی جاتی تو اب تک قسطنطنیہ فتح ہو چکا ہوتا۔ ہم نے شہنشاہ کو بارہا یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ ایک رومی عورت کا خاوند ایران کا وفادار نہیں ہو سکتا۔ لیکن کسریٰ اس غدار کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھا — میں پوری قوت کے ساتھ چلایا۔ "یہ جھوٹ ہے سین غدار نہیں تھا۔ غدار وہ ہیں جو ایران کے ایک عظیم سپاہی کی موت پر خوشیاں منا رہے ہیں۔" بعض لوگ میری بوٹیاں نوچنے کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن ایک افسر نے سپاہیوں کی مدد سے انہیں ایک طرف دھکیل دیا اور پھر مجھ سے کہا۔ "میں سین کا دوست ہوں اور تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن اب اس جگہ شور مچانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اگر تم اس جگہ سین کے ساتھ چند اور بے گناہوں کی لاشیں نہیں دیکھنا چاہتے تو یہاں سے بھاگ جاؤ۔ اس وقت تمہارے ساتھیوں کے لیے پڑاؤ سے زیادہ کوئی جگہ محفوظ نہیں۔" چنانچہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے بھاگ نکلا۔ لیکن تھوڑی دور جا کر میں نے محسوس کیا کہ آپ کو اطلاع

دنیا مزدوری ہے۔ اور میں انہیں چھوڑ کر آپ کے پاس آ گیا ہوں۔"

عاصم نے کرب کی حالت میں اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا: "اگر سین قتل ہو چکا ہے تو اس کا قاتل پرویز نہیں بلکہ میں ہوں۔ میں نے ہی اسے موت کا راستہ دکھایا ——— میں نے ہی اسے صلح کا ایلچی بن کر یہاں آنے پر مجبور کیا تھا ——— کاش میں اس کے ساتھ ہوتا ——— کاش اس سے پہلے میری کھال اتاری جاتی اور میں اس سے یہ کہہ سکتا کہ میں جرم میں ہی نہیں بلکہ سزا میں بھی تمہارے ساتھ شریک ہوں ——— سین کو اپنے مستقبل کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ اسے خلقدون سے روانہ ہوتے وقت بھی اس بات کا یقین تھا کہ وہ موت کے دروازے پہ دستک دینے جا رہا ہے ———"

کلاڈیوس نے ولیریس سے مخاطب ہو کر کہا: "تم اصطبل سے عاصم کا گھوڑا لے آؤ۔ جلدی کرو۔"

ولیریس اصطبل کی طرف بھاگ گیا اور کلاڈیوس نے عاصم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "عاصم! اب تمہیں ہمت سے کام لینا پڑے گا۔ ہم جس مقصد کے لئے یہاں آئے ہیں اس کی تکمیل کے بغیر واپس نہیں جائیں گے۔ لیکن موجودہ حالات میں میں تمہیں ایک لمحہ کے لئے بھی یہاں ٹھہرنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ خدا کیلئے تم یہاں سے نکل جاؤ اور سین کی بیوی اور بیٹی کی حفاظت کی فکر کرو۔ ورنہ مجھے ڈر ہے کہ کسریٰ سین کے وحشیانہ قتل کو جائز ثابت کرنے کیلئے انہیں بھی کسی سازش میں ملوث کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر تم کسی تاخیر کے بغیر وہاں پہنچ جاؤ تو تمہارے لیے انہیں باسفورس کے پار پہنچا دینا مشکل نہیں ہوگا ——— وہاں کوئی تم پر شک نہیں کرے گا۔ اگر تم سے پہلے سین کے قتل کی خبر وہاں پہنچ گئی تو خلقدون کے دروازے تمہارے لیے بند ہوں گے اور تم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکو گے۔ یہاں رہ کر تم ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ مجھے بدترین حالات میں بھی کسریٰ سے یہ توقع نہیں کہ وہ ہمیں موت یا قید کی سزا دے گا۔ ہم ایک ہار ماننے والے حکمران کے ایلچی ہیں۔ ہمارے ساتھ زیادہ سے زیادہ بڑی بدسلوکی یہ ہو سکتی ہے کہ ہمیں دھکے دے کر دست گرد سے نکال دیا جائے لیکن تمہارا معاملہ ہم سے مختلف ہے۔ تم سین کے دوست ہو اور وہ تمہیں کسی نیک سلوک کا مستحق نہیں سمجھیں گے۔ اگر ہمارا انجام انتہائی عبرت ناک ہو تو بھی تم ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

لیکن عاصم کے ذہنی اور جسمانی قویٰ شل ہو چکے تھے۔ اور وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے کلاڈیوس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کلاڈیوس نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا: "عاصم اگر تم کو اپنی جان کی پروا نہیں تو کم از کم یہی خیال کرو کہ تم اس بیچاری فسطینہ کا آخری سہارا ہو۔"

عاصم نے چند بار فسطینہ کا نام دہرایا اور اس کے دل میں زندگی کی ہلکی ہلکی دھڑکنیں بیدار ہونے لگیں۔ پھر اس نے مڑ کر دیکھا، ولیریس اس کا گھوڑا لیے آ رہا تھا۔ اس نے اچانک بھاگ کر اس کے ہاتھ سے گھوڑے کی باگ پکڑ لی لیکن پھر مذبذب کی حالت میں اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

کلاڈیوس چلایا: "اب سوچنے کا وقت نہیں عاصم، خدا کے لئے جلدی کرو!"

سپاہی نے اپنے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے کہا: "چلیے میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں!"

عاصم ایک گہری سانس لینے کے بعد گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ لیکن ابھی وہ بیرونی دروازے سے چند قدم دور تھے کہ چند مسلح سپاہی نمودار ہوئے اور نیزے تان کر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

اگر عاصم کو بھاگ نکلنے کی کوئی امید ہوتی تو شاید وہ دو چار آدمیوں کو کچل ڈالنے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ لیکن آج وہ قوت فیصلہ جو اسے پہاڑوں سے ٹکر لینے پر آمادہ کر دیا کرتی تھی جواب دے چکی تھی اور وہ خون جو خطرات کے وقت اس کی رگوں میں بجلی بن کر دوڑتا تھا منجمد ہو چکا تھا۔ پیادہ سپاہیوں سے پیچھے کشادہ سڑک پر بھی چند سوار دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور ایک ثانیہ صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد اپنے ساتھی سے کہا: "اب بھاگنے کی کوشش بے سود ہے۔"

ایک خوش وضع نوجوان جو ان سپاہیوں کا افسر معلوم ہوتا تھا آگے بڑھا اور اس نے کہا: "تم باہر نہیں جا سکتے!"

"ایک آدمی کا راستہ روکنے کے لیے تمہیں اتنی فوج جمع کرنے کی ضرورت نہ تھی!" عاصم یہ کہہ کر اپنے گھوڑے سے اتر پڑا۔ افسر نے کچھ کہے بغیر ایک سپاہی کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ دوسرا سپاہی عاصم کے ساتھی کی طرف بڑھا اور وہ بھی اپنے گھوڑے سے اتر پڑا۔

نوجوان افسر نے کہا: "انہیں قید خانے میں لے جاؤ!"

سپاہیوں نے عاصم اور اس کے ساتھی کو ایک تنگ گھیرے میں لے لیا تو کلاڈیوس نے جو اپنے ساتھیوں

کی طرح دم بخود ہو کر یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اچانک آگے بڑھ کر ایرانی افسر سے سوال کیا۔ "کیا میں ان کی گرفتاری کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

افسر نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "میں تمہیں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ اگر تمہارے ساتھیوں میں سے کسی اور نے بھاگنے کی کوشش کی تو ہم اُسے بھی قید خانے میں بھیجنے پر مجبور ہوں گے۔"

کلاڈیوس نے کہا۔ "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم بھاگنے کی نیت سے یہاں نہیں آئے اور اگر آپ عاصم کو ہمارے پاس چھوڑ دیں تو ہم اس کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں۔"

عاصم نے مڑ کر کلاڈیوس کی طرف دیکھا اور رومی زبان میں کہا۔ "یہاں میرا کام ختم ہو چکا ہے لیکن تمہارے جتھے کا کام ابھی باقی ہے ممکن ہے کہ سین کی موت پر ایرانی لشکر کے سرکردہ افسروں کا ردعمل کسریٰ کو تمہاری باتیں سننے پر مجبور کر دے۔ اس لئے میری حمایت میں زبان کھول کر اپنی مشکلات میں اضافہ کرنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

افسر نے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم کیا دیکھ رہے ہو۔ اسے لے جاؤ!"

عاصم سپاہیوں کی ننگی تلواروں کے پہرے میں چند قدم چلنے کے بعد اچانک رکا اور افسر کی طرف مڑ کر دیکھتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔ "میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں!"

افسر جلدی سے آگے بڑھ کر بولا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔"

عاصم نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس غریب سپاہی کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں یہ سین کے ایک دوست کے ساتھ پڑاؤ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں اس نے سین کے قتل کی اطلاع سنی شہر میں جا کر اس خبر کی تصدیق کی اور یہ سمجھ کر میرے پاس چلا آیا کہ میں سین کا ایک وفادار دوست اور ساتھی ہوں۔ یہ بات اِس کے ذہن میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ سین کے کسی دوست کو اس کی موت کی اطلاع دینے کے بعد یہ اس مصیبت میں پھنس جائے گا۔ اس لئے آپ اسے میرے ساتھ شامل نہ کریں!"

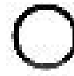
افسر کچھ دیر سوچنے کے بعد اپنے ایک ساتھی سے مخاطب ہوا۔ "تم اسے پڑاؤ میں لے جاؤ اور وہاں اسے کڑی نگرانی میں رکھو۔ پہرہ داروں کو اس کے باقی ساتھیوں کے متعلق بھی یہ ہدایت کر دو کہ تا حکم ثانی ان میں سے کسی کو بھی پڑاؤ سے باہر نکلنے کی اجازت نہ دیں۔ اور یہ گھوڑے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ تمہارے ساتھ پانچ سپاہی کافی ہوں گے۔"

پھر وہ عاصم کی طرف متوجہ ہوا۔ "اب تم کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟"

"ہاں! اگر ہو سکے تو آپ ان معزز رومیوں کو بلاوجہ کوئی تکلیف نہ دیں۔ یہ قیصر کی طرف سے صلح کا پیغام لیکر آئے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ کسریٰ کو صلح اور امن کی اہمیت محسوس کرنے میں زیادہ دیر نہ لگے۔"

افسر نے جواب دیا۔ "میں تمہیں صرف یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ کسریٰ کے حکم کے بغیر ان لوگوں کا بال تک بیکا نہیں ہوگا لیکن شرط یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔"

عاصم نے اطمینان سے ایرانی افسر کی طرف دیکھا اور سپاہیوں کے پہرے میں وہاں سے چل دیا۔



عاصم پانچ دن سے دست گرد کے قلعہ نما قید خانے کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں پڑا ہوا تھا اور خوف و اضطراب کے یہ ایام اسے مہینوں اور برسوں سے زیادہ طویل محسوس ہوتے تھے۔ یہ قید خانہ سیکڑوں زندہ انسانوں کا قبرستان تھا۔ اور یہاں کئی لوگ ایسے تھے جو طویل قید کی صعوبتوں کے باعث ذہنی توازن سے محروم ہو چکے تھے اور عاصم کی پاس کی کوٹھڑیوں سے ان کے عجیب قہقہے اور روح فرسا چیخیں سنا کرتا تھا۔ اُس نے زندگی کے بدترین ادوار میں بھی اس نے امید کا دامن نہیں چھوڑا تھا لیکن اب وہ سارے چراغ جو اس نے اپنے آنسوؤں سے روشن کیے تھے بجھ چکے تھے۔ وہ اپنے ماضی کی ساری پونجی اس قید خانے سے باہر چھوڑ آیا تھا اور مستقبل کے متعلق اس کے حوصلے اور ولولے اس کوٹھڑی کی چار دیواری کے اندر محبوس ہو کر رہ گئے تھے۔ ماضی کے جن ناہموار راستوں پر اس نے اپنے پاؤں کے نشان چھوڑے تھے وہ سب اس جگہ پہنچ کر ختم ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی چند لمحات کیلئے اس کی بے چین روح ہزاروں میل دور ان حسین اور دلکش نخلستانوں، وادیوں اور میدانوں کے طواف کرتی جہاں سرمست ہوائیں آزادی کے گیت گاتی تھیں، درخت جھومتے اور پھول کھلتے تھے۔ لیکن اچانک اس کوٹھڑی کی دیواریں اس کی نگاہوں کے سامنے حائل ہو جاتیں اور وہ دنیا جس پر سورج اپنے نور کے خزانے لٹاتا تھا جسے چاند کی ضیاپاشیاں دلکشی اور رعنائی عطا کرتی تھیں اور جس پر ستاروں کی مسکراہٹیں نچھاور ہوتی تھیں، اسے ماضی کا ایک بھولا ہوا خواب اور ایک وہم محسوس ہونے لگتا تھا۔ پھر جب اُس کا دم گھٹنے لگتا تو وہ اٹھ کر تنگ چار دیواری کے اندر ٹہلنا شروع کر دیتا۔

آس پاس کی کوٹھڑیوں سے اُسے کسی کا مہیب قہقہہ یا کسی کی بھیانک چیخ سنائی دیتی اور وہ نڈھال سا ہو کر بیٹھ جاتا۔

"کیا میں زندہ رہوں گا! کیا زندگی یہی ہے! کیا میرے لئے اس سے بہتر موت نہیں ہو سکتی تھی! آخر میں یہاں کیوں آیا تھا؟ جب تک مجھے سین کے قتل کی اطلاع نہیں ملی تھی مجھے یہ اطمینان تھا کہ میں کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے رہا ہوں، لیکن اب مجھے یہ ساری باتیں ایک مذاق معلوم ہوتی ہیں۔ میں ایک ایک قدم چل کر اپنی تباہی کی آخری منزل تک پہنچا ہوں۔ آخر روم اور ایران کی جنگ یا صلح سے میرا کیا تعلق تھا! میں نے یہ کیوں سوچا کہ میں اس دنیا کی ساری مصیبتوں کا علاج کر سکتا ہوں! یہ میرے بس کی بات نہیں اور سین کو بھی اس بات کا یقین تھا کہ روم اور ایران میں مصالحت کرانا اس کے بس کی بات نہیں۔ خلقدون سے روانہ ہوتے وقت اس کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ موت کے دروازے پر دستک دینے جا رہا ہے۔ وہ کون سا جذبہ تھا جو اسے یہاں تک لے آیا تھا؟ اگر میں اس کے پاس نہ آتا، اگر صلح کا ایلچی بننے پر اسے آمادہ نہ کرتا تو یہ حالات کیوں پیدا ہوتے!"

پھر انتہائی کرب کی حالت میں وہ اپنی مٹھیاں بھینچ کر چلاتا۔ "میں سین کا قاتل ہوں۔ میں نے اسے وہ منزل دکھائی تھی جہاں موت اس کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔ میں کیا کر سکتا تھا!"

جب ذہنی اذیت ناقابل برداشت ہو جاتی تو پھر ایک بار تصورات کی دنیا میں کوئی جائے پناہ تلاش کرتا۔ اس کی روح خلقدون کے قلعے کا طواف کرنے لگتی۔ فسطینہ کسی گوشے سے نمودار ہوتی اور وہ سراپا عجز و انکسار بن کر کہتا۔

"فسطینہ میں تمہارا مجرم ہوں۔ کاش میں تمہارے باپ کو دست گرد جانے کا مشورہ نہ دیتا۔ مجھے معاف کر دو فسطینہ! میری طرف دیکھو۔ اس دنیا میں تمہارے سوا میرا کوئی نہیں۔ میں سب کچھ کھو چکا ہوں۔ لیکن تم میری ہو ——— تم میری ہو۔ اب میں روم اور ایران کی بجائے صرف تمہارے متعلق سوچوں گا۔ فسطینہ مجھے معاف کر دو۔ میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ میں تمہاری سسکیاں نہیں سن سکتا۔"

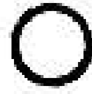
پھر جب اس کی آہیں چیخوں میں تبدیل ہونے لگتیں تو وہ دہشت زدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ جاتا اور حسین سپنوں کے موتی بکھر جاتے۔ باہر کی دنیا پھر ایک بار کوٹھڑی کی دیواروں کے ادھر روپوش ہو جاتی۔ لیکن کچھ دیر بعد اسے پھر یہ محسوس ہونے لگتا کہ فسطینہ اس کی روح کی گہرائیوں سے نکل کر ایک بھیانک خلا کو پُر کر رہی ہے اور اس کے آنسو اور اس کی مسکراہٹیں اس کے دل میں زندہ رہنے کی خواہش بیدار کر رہے ہیں۔

ہر روز ایک بار اس کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلتا اور پہریدار عاصم کو کھانا اور پانی دے کر چلے جاتے۔ شروع کے دو دن اس نے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ لیکن تیسرے دن قید خانے کا ایک افسر اس کے پاس آیا۔ اور اس نے کہا۔ "ہمیں تورج کا حکم ہے کہ تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہ دی جائے اور ہم نے تمہارے لیے عام قیدیوں سے بہتر خوراک کا انتظام کیا تھا۔ لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ یہاں فاقہ کشی سے صرف وہ قیدی مرنے کی کوشش کرتے ہیں جو چاروں طرف سے مایوس ہو چکے ہوں۔ اگر تورج جیسے لوگ تمہارے ہمدرد ہیں تو تمہیں اس قدر مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ جو شخص سین کا ساتھی رہ چکا ہو اسے اس قدر بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ فوج میں سین کے بے شمار ساتھی تمہاری رہائی کی کوشش کریں گے۔ اگر تم اس دنیا کی تمام دلچسپیوں سے منہ نہیں موڑ لیا تو تمہیں زندہ رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کسریٰ کو اپنی رائے تبدیل کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ ہم نے کئی وزیروں اور سپہ سالاروں کو تختہ دار پر لٹکتے دیکھا ہے اور کئی خوش نصیب قیدیوں پر انعامات کی بارش ہوتے دیکھی ہے۔"

عاصم نے ملتجی ہو کر کہا۔ "آپ تورج کو میرا یہ پیغام دے سکتے ہیں کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"میں تورج کو تمہارا پیغام پہنچا دوں گا۔ لیکن موجودہ حالات میں شاید وہ کھلے بندوں تم سے ملاقات نہ کر سکیں۔ شاید تم کو چند ہفتے یا چند مہینے انتظار کرنا پڑے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی دن وہ تمہاری رہائی کا حکم لے کر یہاں پہنچ جائیں۔"

قید خانے کا افسر عاصم کے ظلمت کدہ میں امید کی ہلکی سی روشنی چھوڑ کر چلا گیا۔ چنانچہ اس نے پہلی بار پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور دیوار سے ٹیک لگا کر اپنی رہائی کی تدبیریں سوچنے لگا۔



چھٹے روز چار مسلح پہریداروں نے عاصم کو اس کی کوٹھری سے نکالا اور قید خانے کے داروغہ کی قیام گاہ کے ایک کشادہ کمرے میں لے گئے۔ وہاں داروغہ کے علاوہ تورج اور ایک عمر رسیدہ آدمی جو اپنے لباس سے ایران کے طبقہ اعلیٰ کی نمائندگی کرتا تھا، اس کے منتظر تھے۔

تورج نے پہریداروں کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ پھر وہ عاصم کی طرف متوجہ ہوا "تم ایرج کو اچھی طرح جانتے ہو؟"

"جی ہاں، وہ سین کے کسی دوست یا رشتہ دار کا بیٹا تھا اور میں اس سے کئی بار ملا تھا۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ وہ قتل ہو چکا ہے؟"

"جی ہاں، وہ آوار کے ہاتھوں میری آنکھوں کے سامنے قتل ہوا تھا۔"

تورج نے بوڑھے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ایرج کے والد ہیں اور اپنے بیٹے کے قتل کی اطلاع پہنچنے کے بعد مدائن سے یہاں پہنچے ہیں۔"

عاصم نے بوڑھے سے مخاطب ہو کر کہا۔ "مرتے وقت آپ کے بیٹے کا سر میری گود میں تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس کی جان نہ بچا سکا۔"

بوڑھا کچھ دیر کرب کے عالم میں عاصم کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ایرج نے مجھے بتایا تھا سین کے گھر میں ایک عرب کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ پھر شاید تم حبشہ کی مہم پر چلے گئے تھے اور اس کے بعد لاپتا ہو گئے تھے۔ اگر تم وہی ہو تو میں تمہاری اطلاع پر یقین کر سکتا ہوں۔ لیکن اگر میرے بیٹے کو سیتھین لوگوں نے قتل کیا تھا تو تم وہاں کیسے پہنچ گئے تھے؟"

عاصم نے جواب دیا۔ "یہ ایک طویل داستان ہے۔ میں حبشہ کے راستے میں زخمی ہو گیا تھا اور میرے ساتھی مجھے شدت بخار کی حالت میں پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ پھر جب میں بے ہوش تھا تو ایک رومی غلام اور قبطی ملاح مجھے بابلیون پہنچانے کی بجائے دریائے نیل کے راستے سمندر تک لے گئے اور وہاں سے مجھے ایک رومی جہاز پر سوار کرا کے قسطنطنیہ پہنچا دیا گیا۔ یہ رومی غلام ایک نہایت بااثر خاندان کا چشم و چراغ تھا اور قسطنطنیہ میں میرے ساتھ اس کا برتاؤ نہایت فیاضانہ تھا۔ قسطنطنیہ سے مجھے اس کے ساتھ اس شہر میں جانا پڑا جہاں قیصر اور آوار قبائل کے خاقان کی دوستانہ ملاقات ہونے والی تھی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس جگہ ایرج کے ساتھ میری آخری ملاقات ہو گی۔"

بوڑھے نے کہا۔ "لیکن تم کہتے ہو کہ میرا بیٹا آوار کے ہاتھوں قتل ہوا ہے؟"

"جی ہاں۔ وہ قیصر پر اچانک حملہ کرنے کی نیت سے وہاں جمع ہوئے تھے۔ لیکن رومیوں پر حملہ کرنے سے پہلے انہوں نے آپ کے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ ایرج خاقان کے پاس ایک ایلچی کی حیثیت سے گیا تھا۔ اس کا کوئی ساتھی بھی واپس

نہیں آیا۔"

"میں نے وہاں کسی اور ایرانی کو نہیں دیکھا۔ ممکن ہے کہ وہ ایرج سے پہلے قتل کیے جا چکے ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ابھی تک خاقان کی قید میں ہوں۔ وحشی آوار کے ضابطۂ اخلاق میں ایک ایلچی کو موت کے گھاٹ اتار دینا ایک معمولی بات ہے۔ اگر سین جیسے آدمی کو اس جرم میں قتل کیا جا سکتا ہے کہ وہ قیصر کے ایلچیوں کو کسریٰ کی شرائط پر صلح کے لیے آمادہ کر کے یہاں لے آیا تھا تو آوار نے ایرج کو قتل کرنے کا بھی کوئی جواز نکال لیا ہو گا۔ ممکن ہے کہ انہیں ایرج کی کسی بات پر شبہ ہو گیا ہو۔"

عاصم کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ اگر اس نے ایرج کے ساتھ اپنی ملاقات کی تفصیلات ظاہر کرنے کی کوشش کی تو یہ مسئلہ زیادہ الجھ جائے گا۔ اور اس پر طرح طرح کے شبہات کیے جائیں گے۔

چنانچہ تورج اور ایرج کے باپ کے متعدد سوالات کے جواب میں اس نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ جناب میں یہ نہیں جانتا کہ آپ کا بیٹا ہرقلیہ کیوں آیا تھا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ سیتھین اس کے دشمن کیوں ہو گئے۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ اس نے سیتھین سپاہیوں کے نرغے سے نکل کر اس طرف بھاگنے کی کوشش کی تھی جہاں رومی سپاہی کھڑے تھے۔ لیکن قبل اس کے کہ رومی اس کی کوئی مدد کر سکتے وہ ایک سیتھین سوار کے نیزے سے زخمی ہو کر گر پڑا۔ اس کے بعد خاقان کے طوفانی دستے وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے رومیوں پر حملہ کر دیا۔ اب رہا یہ سوال کہ انہوں نے آپ کے بیٹے کو قتل کیوں کیا۔ اس کا صحیح جواب صرف وہ لوگ دے سکتے ہیں جو ایرج کے ساتھ گئے تھے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں ہو گا۔"

بوڑھے نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "کیا یہ ممکن نہیں کہ میرے بیٹے کو رومیوں نے قتل کیا ہو؟"

عاصم نے قدرے پریشان ہو کر جواب دیا۔ "اگر رومی اس قتل کے مجرم ہوتے تو مجھے آوار کو اس کے قتل کا الزام دینے کی کیا ضرورت تھی۔"

"تم رومیوں کے ساتھی ہو۔"

عاصم نے کرب انگیز لہجے میں جواب دیا۔ "میں صرف سین کا ساتھی تھا اور میں یہ سمجھتا تھا کہ سین کے دوست میرے دوست اور سین کے دشمن میرے دشمن ہیں۔ لیکن سین مر چکا ہے اور اب میرا کوئی دوست یا دشمن نہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ میں ایرج کی موت کے اسباب کے متعلق آپ کی تسلی نہیں کرسکا۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اسے سیتھین نے قتل کیا اور مرتے وقت جب میں نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی تھی۔ تو میرے متعلق اس کے تاثرات ایک دوست اور بھائی کے تاثرات سے مختلف نہ تھے۔ ہم دونوں کو اس بات کا افسوس تھا کہ زندگی میں ہم ایک دوسرے کے قریب کیوں نہ آسکے۔ میں نے یہ باتیں آپ کو خوش کرنے کے لیے نہیں کہیں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ اب آپ کی خوشی یا ناراضگی میری قسمت پر اثر انداز نہیں ہوسکتی۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم جھوٹ نہیں کہتے اور میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ میں اس شخص کی کوئی مدد نہیں کرسکتا جس نے میرے بیٹے کو مرتے وقت سہارا دیا تھا۔" ایرج کا باپ یہ کہہ کر غور سے عاصم کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

تورج نے قید خانے کے داروغہ سے مخاطب ہوکر کہا۔ "تم انہیں دروازے تک چھوڑ آؤ۔ میں قیدی سے چند ضروری باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔"

داروغہ نے تورج کے حکم کی تعمیل کی اور وہ تھوڑے سے توقف کے بعد عاصم سے مخاطب ہوا۔ "جب ایک آدمی شیر کے منہ میں اپنا سر دے چکا ہو تو اس کے بہترین دوست بھی اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتے۔ میں سین کے معاملے میں بے بس تھا۔ لیکن تمہارا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ تم اگر ہوش سے کام لو تو شاید اپنی جان بچا سکو۔ اگر تم میری نصیحت پر عمل کرو تو ممکن ہے کہ شہنشاہ کچھ عرصہ بعد تمہیں قید سے آزاد کرنے پر بھی رضامند ہوجائے۔ میری بات غور سے سنو۔ سین کا خون رائگاں نہیں گیا۔

ہمیں ملک کے کئی شہروں سے اس قسم کی اطلاعات ملی ہیں کہ شہنشاہ کے بعض دشمن سین کو مظلوم ثابت کر کے لوگوں کو بغاوت پر اکسا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ فوج میں ایک عنصر ایسا ہے جو جنگ کی طوالت سے تنگ آچکا ہے۔ کل شہنشاہ نے پہلی بار دستگرد کے امراء اور فوج کے اعلیٰ افسروں سے یہ مشورہ لینے کی ضرورت محسوس کی تھی کہ روم کے ایلچیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ اور ہماری اکثریت نے یہ رائے دی تھی کہ شہنشاہ اول تو ان سے ملاقات کریں۔ ورنہ انہیں حفاظت سے واپس بھیج دیں۔ دستگرد کے بڑے کاہن کے علاوہ صرف چند امراء ایسے تھے جنہوں نے رومیوں کے لیے قتل یا قید کی سزا کا مطالبہ کیا تھا۔ شہنشاہ نے ملاقات کی تجویز منظور کرلی ہے۔ اور

رومیوں کے متعلق یہ حکم دے دیا گیا ہے کہ سردست ان کے ساتھ انتہائی معزز مہمانوں کا سا سلوک کیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ شہنشاہ انہیں بہت جلد شرفِ باریابی عطا کریں گے۔ اور اگر رومیوں نے ان کی تمام شرائط مان لیں تو صلح ہوجائے گی۔ اب تمہارا مسئلہ رہ جاتا ہے۔ میں آج قیصر کے آدمیوں سے ملا تھا اور وہ یہ کہتے تھے ہم سب سے پہلے شہنشاہ کی خدمت میں تمہاری رہائی کی درخواست پیش کریں گے۔ لیکن میں نے انہیں یہ سمجھایا تھا کہ اگر تم نے اس قسم کی کوئی درخواست کی تو وہ ٹھکرا دی جائے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ عاصم کی طرح تم بھی شہنشاہ کے زیرِ عتاب آجاؤ۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم سردست شہنشاہ کے سامنے عاصم کا ذکر تک نہ کرو۔ جب صلح کی شرائط طے ہوجائیں گی تو ممکن ہے کہ عاصم کے حق میں تمہاری آواز بھی مؤثر ثابت ہو۔ اب شاید وہ تمہاری حمایت میں زبان کھول کر اپنی الجھنوں میں اضافہ کرنے کی غلطی نہ کریں۔ لیکن تمہیں اس بات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے تمہارے بچاؤ کا ایک راستہ نکالا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم حقیقت پسندی سے کام لو۔"

قید خانے کا داروغہ کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن تورج نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا "آپ کچھ دیر اور باہر ٹھہریں۔ میں قیدی سے ایک ضروری بات کررہا ہوں۔"

داروغہ الٹے پاؤں باہر نکل گیا اور تورج دوبارہ عاصم کی طرف متوجہ ہوا۔ "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ سین کے قتل پر مختلف شہروں کے عوام کے ردِعمل کے متعلق جو اطلاعات آرہی ہیں ان کے باعث شہنشاہ کافی پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ تم اگر چاہو تو شہنشاہ کی تمام پریشانیاں دور کرسکتے ہو۔"

عاصم نے سوال کیا۔ "میں شہنشاہ کی پریشانیاں کیسے دور کرسکتا ہوں۔۔؟"

"تم ایک مدت سے سین کے ساتھی ہو۔ اور اس کے متعلق تمہاری ہر بات درست مانی جائے گی۔ تم جانتے ہو کہ شہنشاہ رعایا کے سامنے اپنی غلطیوں کا اعتراف نہیں کیا کرتے۔ اور انہیں ہر وقت ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو عوام کے سامنے ان کا ہر اقدام صحیح ثابت کرسکیں؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" عاصم نے مضطرب ہوکر سوال کیا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اپنی جان بچانے کے لیے بھرے دربار میں یہ کہنا پڑے گا کہ سین واقعی ایک باغی اور غدار تھا اور اس نے رومیوں کو بچانے کے لیے محاذِ جنگ پر ہمارے لشکر میں بددلی اور مایوسی پھیلا دی تھی۔ تم

یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ سین دل سے عیسائی ہو چکا تھا۔ اور اس کے زیرِ اثر کئی سپاہی عیسائیوں کے حامی بن گئے تھے۔

ایک ثانیہ کے لیے عاصم کا سارا خون سمٹ کر اس کے چہرے پر آگیا۔ اور وہ کرب انگیز لہجے میں چلایا۔ "نہیں نہیں! میں اپنی موت سے پہلے مرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں اس شخص پر غلاظت نہیں پھینکوں گا جس کے ساتھ عقیدت، محبت اور وفاداری کا رشتہ میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔"

تورج نے کہا۔ "بیوقوف نہ بنو۔ سین کے ساتھ تمہاری عقیدت اور محبت صرف تمہیں ہلاکت کا راستہ دکھا سکتی ہے۔ اُسے واپس نہیں لا سکتی۔ اگر تم سین کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دو تو وہ تمہارے قید خانے کا دروازہ کھول کر یہ نہیں کہے گا کہ اب تم آزاد ہو۔ اور اگر تم اس کی مذمت کرو تو وہ تمہارے مصائب میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔ اس کی موت کے بعد اس کے ساتھ تمہارے سارے رشتے ختم ہو چکے ہیں۔ لیکن کسریٰ زندہ ہے اور اُسے تمہاری زندگی اور موت پر پورا اختیار ہے۔ اگر تم اپنے لیے نہیں تو ان لوگوں کے لیے زندہ رہنے کی کوشش کرو جنہیں تمہاری ضرورت ہے تم سین کی بیوہ کو سہارا دے سکتے ہو۔ اس کی بیٹی کے آنسو پونچھ سکتے ہو۔"

عاصم نے جواب دیا۔ "ایک گرا ہوا آدمی کسی کا سہارا نہیں بن سکتا۔ اب تک میں یہی سمجھتا تھا کہ اس دنیا میں موت سے بھیانک کوئی چیز نہیں۔ لیکن آپ مجھے ایک ایسی زندگی کا راستہ بتا رہے ہیں جو موت سے زیادہ بھیانک ہے۔ اگر آپ کو میرا امتحان مقصود ہے تو مجھے اپنے شہنشاہ کے سامنے لے چلیے۔ میں بھرے دربار میں یہ اعلان کروں گا کہ میں سین کا دوست ہوں اور میں اس کے قاتل سے اپنے لیے رحم کی بھیک نہیں مانگ سکتا۔ تم سین کی طرح میری کھال اتار سکتے ہو۔ لیکن کوئی اذیت، کوئی خوف اور کوئی لالچ مجھے اس عظیم انسان کے خلاف زبان کھولنے پر آمادہ نہیں کر سکتا ——— میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ میرے زندہ رہنے کو اس قدر اہمیت دے رہے ہیں۔ لیکن میں ایسی حقیر زندگی کا بوجھ نہیں اٹھا۔"

تورج کچھ دیر ٹکٹکی باندھ کر عاصم کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ اچانک اپنی کرسی سے اٹھ کر آگے بڑھا اور عاصم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "میرے دوست میں بے بس ہوں۔ اگر میں کسریٰ کی طرح با اختیار ہوتا، تو میرا پہلا حکم یہ ہوتا کہ اس قیدی کی بیڑیاں اتار دی جائیں۔ اور ایران کے سارے خزانے اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیئے جائیں۔"

عاصم نے کہا۔ "اگر آپ مجھ سے خفا نہیں ہوئے تو میری یہ درخواست ہے کہ آپ سین کی بیوی اور بیٹی کو مصیبت سے بچانے کی کوشش کریں۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ان کا انجام سین سے زیادہ عبرتناک نہ ہو۔"

"میں تم سے خفا نہیں ہوں بلکہ مجھے تم پر رشک آتا ہے۔ سردست کسریٰ کی توجہ سین اور اس کی بیوی کی طرف مبذول نہیں ہو سکتی۔ اور ہم اس بات کی پوری کوشش کریں گے کہ ان پر کوئی مصیبت نہ آئے۔ میں تمہارے مستقبل کے متعلق بھی بہت زیادہ مایوس نہیں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ صلح کے بعد ہمارے لیے تمہیں رہا کرانا مشکل نہیں ہو گا۔ کسریٰ محاذِ جنگ کی کمان مجھے دینا چاہتا تھا۔ لیکن رومیوں کے ساتھ بات چیت کا فیصلہ کرنے کے لیے مجھے چند دن کے لیے روک لیا گیا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ صلح کے بعد محاذِ جنگ پر میری ضرورت نہیں ہو گی۔" تورج نے یہ کہہ کر تالی بجائی۔ قید خانے کا داروغہ اور مسلح سپاہی اندر داخل ہوئے۔ اس نے عاصم کو لے جانے کا حکم دیا۔

باب ۳۶

پرویز نے رومی ایلچیوں کو شرفِ باریابی عطا کرنے سے پہلے اُن کے سامنے صلح کی شرائط پیش کرنے کی ذمہ داری اپنے وزراء اور فوج کے عہدہ داروں کے علاوہ اُن مجوسی کاہنوں کو سونپ دی تھی جو عیسائیوں کی تذلیل اپنا مذہبی فریضہ خیال کرتے تھے۔ اور ان لوگوں نے چند دن غور و فکر کے بعد ہرقل کے ایلچیوں کے سامنے جو مسودہ پیش کیا تھا، وہ ایسی توہین آمیز شرائط پر مشتمل تھا جو صرف ایک ظالم فاتح اپنے پاؤں میں گرے ہوئے دشمن کی شاہ رگ پر تلوار رکھ کر منوا سکتا تھا۔ لیکن رومیوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

جب پرویز کو اُس کے نمائندوں نے یہ اطلاع دی کہ ہرقل کے ایلچی زہر کے تلخ گھونٹ اپنے حلق سے اُتارنے پر آمادہ ہو گئے ہیں تو اُس نے ایک دن پوری شان و شوکت کے ساتھ اپنا دربار منعقد کیا، اور ہرقل کے ایلچی بے بس قیدیوں کی طرح وہاں لائے گئے۔

ایک بلند چبوترے پر جو بیش قیمت قالینوں سے آراستہ تھا، شہنشاہ کی مسند کے قریب سونے کے آتشدان میں مقدس آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور چبوترے سے نیچے سلطنت کے اکابر حسبِ مراتب صفیں باندھے کھڑے تھے۔ ملکہ شیریں شہنشاہ کے پہلو میں رونق افروز تھی۔

رومیوں کے لئے یہ وسیع ہال جس کے ستون اور دیواریں سونے اور چاندی سے مزیّن، فرش بیش قیمت قالینوں سے آراستہ تھے اور جس کی چھت لاتعداد فانوسوں سے سجائی گئی تھی، ایک طلسم کدہ تھا۔ وہ حاضرینِ دربار کی قبائیں اور جواہرات سے مرصع ٹوپیاں دیکھتے اور انہیں ایسا محسوس ہوتا کہ دنیا کی

ساری دولت سمٹ کر اس دربار میں جمع ہو گئی ہے۔ وہ یہ اُمید لے کر آئے تھے کہ شاید کجکلاہِ ایران اُن کی التجائیں سُن کر صُلح کی شرائط نرم کرنے پر آمادہ ہو جائے، لیکن ابھی وہ مسند سے چند قدم دُور تھے کہ سپاہیوں نے اُن کی گردنیں دبوچ لیں اور انہیں زبردستی سربسجود ہونے پر مجبور کر دیا۔ پھر چند ثانیے بعد کسریٰ کے ہاتھ کا اشارہ پا کر سپاہیوں نے انہیں بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھا دیا اور وہ دم بخود ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگے۔

نقیب رُومی زبان میں چلّایا: "تم فاتح عالم کے دربار میں کھڑے ہو۔ اگر جان عزیز ہے تو اپنی گستاخ نگاہیں نیچی کرو۔"

اُنہوں نے حکم کی تعمیل کی لیکن چند ثانیے بعد سائمن نے قدرے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"عالیجاہ! ہم ہرقل کی طرف سے......"

نقیب دوبارہ چلّایا: "خاموش تمہیں فاتح عالم کے ساتھ ہمکلام ہونے کی جرأت نہیں کرنی چاہیے۔"

سائمن کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔

پرویز کے وزیر نے شہنشاہ سے مخاطب ہو کر کہا: "فاتح عالم! آپ کا ادنیٰ غلام صلح کی شرائط کا اعلان کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔"

کسریٰ نے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور وزیر نے یہ اعلان کیا: "فاتح عالم، فرمانروائے اعظم خسرو پرویز نے صلح کے لیے روم کے حکمران ہرقل کی التجا قبول فرماتے ہوئے اُس کے بااختیار نمایندوں کے ساتھ حسبِ ذیل شرائط طے فرمائی ہیں۔

ہرقل شام، فلسطین، مصر، آرمینیا اور ایشیائے کوچک کے تمام مفتوحہ علاقوں پر شہنشاہِ ایران کی حکمرانی تسلیم کرتا ہے۔ فاتح عالم یہ اعلان فرماتے ہیں کہ وہ باسفورس کے مغرب میں رومی سلطنت کے کسی اور حصہ پر قبضہ نہیں کریں گے اور اس کے بدلے رُومی انہیں، ایک ہزار ٹالنٹ سونا، ایک ہزار ٹالنٹ چاندی، ایک ہزار حریر کی قبائیں، ایک ہزار بہترین گھوڑے اور ایک ہزار رُومی دوشیزائیں بطور خراج پیش کریں گے۔ اگر چھ ماہ کے عرصے میں یہ شرائط پوری نہ کی گئیں تو یہ معاہدہ کالعدم سمجھا جائے گا۔

اب شہنشاہِ عالم ہرقل کے ایلچی سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ انہیں یہ شرائط قبول ہیں؟"

سائمن نے کسریٰ کی طرف دیکھا اور بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "عالیجاہ! ہرقل کو آپ کے احکام کی تعمیل سے انکار نہیں ہوگا۔ لیکن رُوم کے حالات آپ سے پوشیدہ نہیں۔ ہرقل کو اتنا خراج جمع کرنے کے لیے زیادہ مہلت کی ضرورت ہوگی۔"

ملکہ نے شہنشاہ کو اپنی طرف متوجہ کرکے کچھ کہا اور وہ پہلی بار سائمن سے مخاطب ہُوا۔ "اگر ہرقل نے ہمیں اِس بات کا اطمینان دلا دیا کہ وہ نیک نیتی سے ہماری شرائط پورا کرنا چاہتا ہے تو ہم اس کی درخواست پر اُسے مزید مہلت دینے کے متعلق سوچیں گے۔"

سائمن نے کہا۔ "عالیجاہ! میں آپ کو یہ اطمینان دلا سکتا ہُوں کہ ہرقل آپ کی شرائط تسلیم کرنے میں پس و پیش نہیں کرے گا اور اس سلسلے میں اُن کے اپنے ہاتھ کی تحریر آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔"

پرویز نے کہا۔ "تم ہرقل کو ہماری طرف سے یہ پیغام دے سکتے ہو کہ اگر اُس نے حیلہ جوئی سے کام لیا تو ہمارے سپاہی دُنیا کے آخری کونے تک اُس کا پیچھا کریں گے اور قسطنطنیہ کا نام و نشان تک مٹا دیا جائے گا۔"

سائمن نے جواب دیا۔ "عالیجاہ! ہرقل کو اس بات کا پورا احساس ہے کہ آپ کی ناراضگی ہمارے لیے کس قدر تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر فاتح عالم مجھے اجازت دیں تو میں ایک التجا کرنا چاہتا ہُوں۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"عالیجاہ! ایک عرب نے دستگرد تک ہماری راہنمائی کی تھی اور اب وہ آپ کی قید میں ہے۔ اُس کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ رُوم اور ایران کی صلح کا خواہش مند تھا۔ میری التجا ہے کہ اُسے رہا کر دیا جائے۔"

پرویز نے غضب ناک ہو کر کہا۔ "وہ عرب ایران کے ایک ایسے غدّار کا دوست تھا، جسے موت کے گھاٹ اتارا جا چکا ہے۔ اور ہم تمہیں اُس کی حمایت میں زبان کھولنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ تم جا سکتے ہو۔"

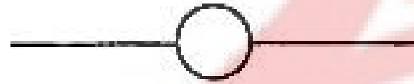
سائمن نے سر جھکا کر سلام کیا اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اُلٹے پاؤں باہر نکل آیا۔

دستگرد کا بڑا کاہن آگے بڑھا اور مسند کے قریب کھڑا ہو کر بولا۔ "عالیجاہ! میں آپ کی رعایا کی طرف سے اِس عظیم فتح پر آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اب ایران کے فرزند فخر کے ساتھ سر اُونچا کرکے یہ کہہ سکتے ہیں کہ قیصر اُن کے شہنشاہ کا ایک حقیر غلام ہے۔"

ایک وزیر نے بلند آواز سے نعرہ لگایا۔ "فاتح عالم! آپ کا اقبال بلند ہو اور آپ کے دُشمن ذلیل و خوار ہوں۔" اور حاضرینِ دربار اُس کی تقلید میں آوازیں بلند کرنے لگے۔ "کسریٰ کا اقبال بلند ہو۔ کسریٰ کے دُشمن ذلیل و خوار ہوں۔"

پرویز نے اچانک ہاتھ بلند کیا اور وہ خاموش ہو گئے۔ اُس نے کہا۔ "ہم اس کامیابی کی خوشی میں ایک ہفتہ کے لیے جشنِ عام کا حکم دیتے ہیں۔"

اگلی صبح قیصر کے ایلچی دستگرد سے روانہ ہو چکے تھے۔



ایک رات یوسیبیا اپنے بستر پر سو رہی تھی اور فسطینہ اُس کے قریب دوسرے پلنگ پر تکیے سے ٹیک لگائے کشیدہ کاری میں مصروف تھی۔ کسی نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی اور اُس نے چونک کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

"بیٹی دروازہ کھولو، میں فیروز ہوں۔"

فسطینہ نے ریشمی کپڑا ایک طرف رکھ دیا اور اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ عمر رسیدہ نوکر تذبذب کی حالت میں یوسیبیا کے بستر کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے چچا! امّی جان کو جگا دوں؟"

"نہیں اِس وقت انھیں بے آرام کرنا ٹھیک نہیں۔ تم میرے ساتھ آؤ، دستگرد سے ایک آدمی آیا ہے اور وہ کوئی ضروری پیغام دینا چاہتا ہے۔"

ایک ثانیہ کے لیے فسطینہ کا سارا وجود لرز اُٹھا اور پھر اُس نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش

کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کہاں ہے وہ؟“

”بیٹی میں اُسے کونے کے کمرے میں چھوڑ آیا ہوں۔“

فسطینہ کمرے سے باہر نکلی تو شدتِ اضطراب سے اُس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ اچانک اُس نے رُک کر سوال کیا۔ ”چچا تم نے اس سے ابا جان کے متعلق نہیں پوچھا؟“

”میں نے اُس سے کئی سوال کیے ہیں۔ لیکن وہ یہ کہتا ہے کہ میں صرف سین کی بیٹی یا بیوی سے کوئی بات کر سکتا ہوں۔“

”اگر وہ کوئی اجنبی ہے تو میں امی جان کو جگا دیتی ہوں۔“

”بیٹی وہ کلاڈیوس ہے۔“

”کلاڈیوس! وہی جو ابا جان کے ساتھ گیا تھا؟“

”ہاں!“

”تم نے پہلے یہ کیوں نہیں بتایا؟“ فسطینہ یہ کہہ کر کمرے کی طرف بڑھی۔ کلاڈیوس کمرے کے اندر ٹہل رہا تھا۔

”آپ کب آئے، ابا جان کہاں ہیں؟ آپ تنہا کیوں آئے، آپ کے ساتھی کہاں ہیں؟“ فسطینہ نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر دیئے اور پھر سراپا التجا بن کر کلاڈیوس کی طرف دیکھنے لگی۔

چند ثانیے کلاڈیوس کے مُنہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ پھر اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”آپ کے ابا جان اور عاصم ہمارے ساتھ نہیں آ سکے۔ میں اپنے دُوسرے ساتھیوں کے ساتھ غروبِ آفتاب کے وقت یہاں پہنچا ہوں۔ ہم نے باہر پڑاؤ میں قیام کیا ہے۔ ہم علی الصباح کشتی پر سوار ہو جائیں گے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید میں جانے سے پہلے آپ کو نہ دیکھ سکوں۔ قلعہ کے محافظ نے مجھے بڑی مشکل سے رات کے وقت اندر آنے کی اجازت دی ہے۔ آپ کی امی جان کیسی ہیں؟“

”اُن کی طبیعت کئی دنوں سے خراب ہے آج وہ سو گئی تھیں اور میں نے انہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا لیکن اگر ضروری ہو تو میں انہیں بلا لاتی ہوں۔“

”نہیں، نہیں، انہیں تکلیف نہ دیجیے۔ آپ بیٹھ جائیں، میں آپ سے چند ضروری باتیں کہنا چاہتا ہوں۔“

فسطینہ اضطراب کی حالت میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی، کلاڈیوس کچھ دیر پریشانی کی حالت میں دروازے کے سامنے فیروز کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اُس نے کہا۔ ”کچھ کہنے سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ اپنے نوکر پر کہاں تک اعتماد کر سکتی ہیں؟“

فسطینہ نے جواب دیا۔ ”ابا جان نے فیروز کی وفاداری پر کبھی شبہ نہیں کیا، اور میں اسے چچا فیروز کہا کرتی ہوں۔“

کلاڈیوس نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ میں عاصم کا دوست ہوں؟“

”مجھے معلوم ہے اور میں آپ کو اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔ لیکن خدا کے لیے آپ میری قوتِ برداشت کا امتحان نہ لیں۔“

کلاڈیوس نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ فسطینہ کے سر پر رکھ دیئے اور انتہائی کرب انگیز لہجے میں کہا۔ ”میری بہن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے لیے کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آیا۔ میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں کہ میں تمہیں تسلی دے سکوں۔ میری ذمہ داری تمہیں اور تمہاری والدہ کو ایک بہت بڑے خطرے سے نکالنا ہے اور اس ذمہ داری سے میں اُس صورت میں عہدہ برآ ہو سکتا ہوں کہ تم حوصلے اور ہمت سے کام لو —— میں یہ جانتا ہوں کہ میں دستِ گرد سے جو خبر لایا ہوں اُسے سننے اور برداشت کرنے کے لیے ایک پہاڑ جیسے دل کی ضرورت ہے۔ لیکن حالات کا تقاضا یہ ہے کہ تمہاری چیخیں تمہارے سینے میں دبی رہیں اور تمہارے آنسو تمہاری آنکھوں سے باہر نہ نکلیں۔“

فسطینہ سکتے کے عالم میں کلاڈیوس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور کلاڈیوس ایسا محسوس کر رہا تھا کہ اُس کے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے۔ ”فسطینہ!“ اُس نے تھوڑے توقف کے بعد کہا۔ ”تمہارا باپ واپس نہیں آئے گا۔ اُسے پرویز نے قتل کر دیا ہے۔ عاصم کو قید کر لیا گیا ہے اور ممکن ہے کہ وہ کسی دن آزاد ہو کر تمہارے پاس پہنچ جائے لیکن دستِ گرد میں تمہارے باپ کے دوستوں کو اس بات کا خدشہ

ہے کہ شاید تمھارے متعلق بھی پرویز کی نیت ٹھیک نہ ہو ــــ مجوسی کاہن اُسے ہر وقت تمھارے خلاف مشتعل کرسکتے ہیں۔ تمھارے خلاف اُن کا یہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ تم عیسائی ہو۔ اب پرویز کی سلطنت میں تمھارے باپ کے کسی عزیز یا ساتھی کی زندگی محفوظ نہیں۔ کاش کوئی ایسی صُورت ہوتی کہ ہم تمھیں اپنے ساتھ قسطنطنیہ لے جاتے لیکن یہ ممکن نہیں۔ ایران کے سفیر ہمارے ساتھ جا رہے ہیں۔ پرسوں رات اگر تم کسی بہانے یہاں سے نکل سکو تو شہر سے باہر قریباً تین میل، جنوب کی طرف سمندر کے کنارے ایک اُجڑی ہوئی خانقاہ کے قریب چند آدمی تمھارا اِنتظار کر رہے ہوں گے۔ اگر میں کسی وجہ سے اُن کے ساتھ نہ آسکا تو میری جگہ ولیریس وہاں موجود ہوگا۔ ہمارا جہاز ساحل سے دُور کھڑا رہے گا اور تمھارے لیے رات کے وقت ایک کشتی بھیج دی جائے گی۔ آپ میری باتیں سُن رہی ہیں؟"

فسطینہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دیر تک پتھر کی بے جان مُورتی کی طرح بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ پھر اچانک اُس نے ایک جھرجھری لی اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

کلاڈیوس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "تمھارے باپ کی آخری خواہش یہی ہو سکتی تھی کہ تم مجوسیوں کے انتقام سے بچ کر کسی محفوظ جگہ پہنچ جاؤ۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ قسطنطنیہ کب تک محفوظ رہے گا۔ لیکن میں تمھارے ساتھ یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ جب تک باسفورس کا پانی ہمارے خون سے سُرخ نہیں ہو جاتا اور جب تک قسطنطنیہ کی گلیوں اور بازاروں میں ہماری لاشوں کے انبار نہیں لگ جاتے ہم تمھاری جان اور عزّت کی حفاظت کریں گے۔ کم از کم تمھیں یہ شکایت نہیں ہوگی کہ قیصر کے کسی سپاہی نے اپنے زندگی میں سین کی بیوی اور بیٹی کی بے بسی کا منظر دیکھا ہے۔

سین نے جس مقصد کے لیے قربانی دی ہے وہ صرف اس حد تک پُورا ہُوا ہے کہ پرویز نے ہمارے ساتھ گفتگو کرنا قبول کرلیا تھا۔ لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ صلح کے لیے اُس کی توہین آمیز شرائط انتہائی بُزدل رومیوں کے لیے بھی ناقابلِ قبول ہوں گی ــــ ہمارے لیے دستِ گرد سے زندہ واپس آنے کی یہی ایک صُورت تھی کہ ہم پرویز کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیں لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اب امن کی بجائے رُوم اور ایران کے درمیان ایک فیصلہ کن معرکے کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ آپ کے لیے یہ سمجھنا

مشکل نہیں کہ جنگ کی صُورت میں ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکیں گے۔

ابھی تک یہاں سین کی موت کے متعلق کوئی سرکاری اطلاع نہیں پہنچی۔ دست گرد سے جو ایرانی ہمارے ساتھ آئے ہیں انھوں نے صرف ایرانی فوج کے چند بڑے عہدہ داروں سے باتیں کی ہیں اور قائم مقام سپہ سالار نے انھیں بڑی سختی سے یہ ہدایت کی ہے کہ وہ عام سپاہیوں سے اس حادثے کا ذکر نہ کریں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ بہت جلد یہ خبر سارے لشکر میں مشہور ہوجائے گی اور اس کے بعد تمھارے لیے قلعے سے باہر نکلنا ناممکن ہو جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دو چار دنوں تک پرویز کا ایلچی تمھیں دست گرد پہنچانے کا حکم لے کر آجائے اور یہاں تمھارے باپ کے بہترین دوست بھی تمھارے لیے کچھ نہ کرسکیں۔ اس لیے ابھی یہ بات کسی پر ظاہر نہیں ہونی چاہیئے کہ تمھیں اپنے باپ کی موت کی اطلاع مل چکی ہے۔ میری بہن! میں یہ جانتا ہوں کہ اس وقت تمھارے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ لیکن یہ جگہ آنسو بہانے کے لیے موزوں نہیں ہے۔"

فسطینہ نے بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین نہیں آتا کہ پرویز نے میرے باپ کو قتل کر دیا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اتی جان! کہا کرتی ہیں کہ وہ بچپن کے دوست تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ اگر آپ کی باتیں دُرست ہیں تو میں زندہ رہ کر کیا کروں گی؟"

کلاڈیوس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو چکی تھیں۔ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "فسطینہ تمھارا باپ مر چکا ہے۔ لیکن عاصم زندہ ہے، اور تمھیں اس کے لیے زندہ رہنا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ رہائی کے بعد وہ تمھاری تلاش میں دُنیا کا کونہ کونہ چھان مارے گا۔ کیا تم یہ گوارا کرلوگی کہ تم ایک قیدی کی حیثیت میں دست گرد پہنچا دی جاؤ اور کسریٰ کے محل کی دیواریں مرتے دم تک عاصم اور تمھارے درمیان حائل رہیں، تمھیں معلوم ہے کہ اب بھی وہاں تم جیسی تین ہزار لڑکیاں موجود ہیں، جن کی فریاد اُن کے والدین، اُن کے بھائیوں یا شوہروں کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی؟"

فسطینہ نے شدّتِ کرب سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔

کلاڈیوس قدرے توقف کے بعد فیروز کی طرف متوجہ ہُوا۔ "میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔

اگر تم سین کے وفادار ہو تو تم ان کی مدد کر سکتے ہو — پرسوں رات میرے آدمی تمہیں یہاں سے نکالنے کی کوشش کریں گے، اور یہ اُن کی پہلی اور آخری کوشش ہوگی۔ اس کے بعد ہمیں شاید دوسرا موقع نہ مل سکے۔ اگر فوج کا کوئی بڑا افسر تمہارے آقا کا وفادار ہے تو وہ میری باتوں کی تصدیق کر دے گا۔"

فیروز کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، اُس نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ فوج کا کوئی افسر مجھ سے یہ خبر چھپانے کی کوشش نہیں کرے گا، لیکن مجھے تصدیق کی ضرورت نہیں — میرے آقا کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ دست گرد سے واپس نہیں آئیں گے۔ اب اگر پرسوں تک کوئی اور حادثہ پیش نہ آگیا تو ہم سمندر کے کنارے آپ کی کشتی کا انتظار کریں گے۔ میں وہ پرانی خانقاہ کئی بار دیکھ چکا ہوں۔"

کلاڈیوس نے فسطینہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی والدہ کو تسلی نہیں دے سکا۔ لیکن اگر وہ یہاں موجود ہوتیں تو شاید میرا کام اور زیادہ مشکل ہو جاتا۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔"

فسطینہ نے اُس کی طرف دیکھا لیکن کوشش کے باوجود اُس کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔

کلاڈیوس ایک ثانیہ کے بعد خدا حافظ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا اور فیروز اس کے پیچھے ہو لیا۔

باب ۳۷

سلطنت روما کی صدیوں کی عظمت خاک میں مل چکی تھی اور کجکلاہ ایران قیصر کے ایلچیوں سے انتہائی توہین آمیز شرائط منوانے کے بعد روئے زمین کا مغرور ترین انسان بن چکا تھا۔ عوام فتح کا جشن منا چکے تھے اور ان سات دنوں میں ان کے میکدے شراب سے خالی ہو چکے تھے۔ کسریٰ کے مفتوحہ ممالک کی افواج کو اپنے حکمران کی کامیابی کی اطلاع ذرا تاخیر سے ملی۔ تاہم انھوں نے بھی جشن کی رسومات پورے جوش و خروش سے ادا کیں۔ بے بس عوام کے لیے یہ دن قیامت کے دن تھے۔ شراب سے بدمست سپاہیوں کی ٹولیاں ان دنوں بھوکے بھیڑیوں کی طرح انسانوں کی بستیوں میں گھومتی تھیں اور وحشت اور بربریت کے جگر خراش مناظر جو ان لوگوں نے اپنی شکست کے ایام میں دیکھے تھے وہ پھر ایک بار پوری شدت کے ساتھ دہرائے جا رہے تھے۔ ایشیائے کوچک مصر اور شام کی فضائیں ظالموں کے قہقہوں اور مظلوموں کی چیخوں سے لبریز تھیں۔

کسریٰ کے لیے اس جشن کے بعد بھی ہر دن جشن کا دن تھا۔ وہ عام طور پر شراب سے مدہوش رہتا تھا اور جب کبھی شراب کا نشہ کم ہونے لگتا یا رقص و موسیقی کی محفلوں سے اسے کچھ اکتاہٹ محسوس ہوتی تو وہ ان خوشامدیوں اور جی حضوریوں کو اپنے گرد جمع کر لیتا جو کیخسرو اور دارا کی فتوحات کے ساتھ اس کی کامیابیوں کا موازنہ کر کے اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے کہ ان میں سے کوئی آپ کا ہم پلہ نہیں تھا۔ مجوسی کاہن بظاہر اسے ایک دیوتا کا رتبہ دیتے تھے لیکن انھیں اس بات کا افسوس تھا کہ سینٹ صوفیہ اور سلطنت روما کے دوسرے عظیم گرجوں کو آتش کدوں میں تبدیل نہیں کر سکے۔

ایک دن یمن کا ایرانی گورنر سالانہ لگان کی رقم سرکاری خزانے میں جمع کرانے کے لیے دست گرد پہنچا۔

پرویز نے اس کی آمد کی اطلاع ملتے ہی اسے اپنے پاس طلب کیا اور یمن کے حالات پوچھنے کے بعد سوال کیا۔ "ہم نے سنا ہے کہ عرب کے کسی باشندے نے خدا کا نبیؐ ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ تم اس کے متعلق کیا جانتے ہو؟"

گورنر نے جواب دیا۔ "عالیجاہ! میں نے صرف یہ سنا ہے کہ یہ نبیؐ مکہ میں پیدا ہوا ہے اور اس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس پر خدا کا کلام نازل ہوتا ہے۔"

"تمہیں یہ معلوم ہے کہ اس نبیؐ نے رومیوں کے ہاتھوں ہماری شکست کی پیش گوئی کی ہے؟"

"میں نے یہ سنا ہے عالیجاہ! لیکن آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ اہلِ مکہ نے نبوت کے اس دعویدار اور اس پر ایمان لانے والے چند نادار اور بے بس لوگوں کو وہاں سے نکال دیا ہے اور اس نے وہاں سے کئی منزل دور یثرب میں پناہ لی ہے اس کے بعد مکہ سے جو اطلاعات میرے پاس پہنچی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اس کے اپنے قبیلے کے لوگ اس کے خون کے پیاسے ہیں اور وہ اسے یثرب میں بھی چین نہیں لینے دیں گے۔ عالیجاہ! شام سے مکہ کے راستے یمن آنے والے تاجر مجھے عرب کے حالات سے باخبر رکھتے تھے اور میں ان کی زبانی اکثر یہ سنا کرتا تھا کہ جب مکہ میں ہماری فتوحات کی خبریں پہنچتی ہیں تو وہاں کے لوگ اس نبیؐ کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اب حضور کے دربار میں قیصر کے ایلچیوں نے جس بے چارگی کا ثبوت دیا ہے اس کے بعد عرب کا کوئی ذی شعور آدمی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ اہل روم دوبارہ سر اٹھا سکیں گے — مجھے یقین ہے کہ جب یثرب میں بھی اس معاہدے کی اطلاع پہنچے گی تو وہاں بھی مکہ کے نبیؐ کا مذاق اڑایا جائے گا لیکن عالیجاہ! میں ان لوگوں کی جسارت پر حیران ہوں جنھوں نے آپ کو اس پیشگوئی کی اطلاع دے کر پریشان کیا ہے۔"

کسریٰ نے برہم ہو کر یمن کے گورنر کی طرف دیکھا اور کہا: "ہمیں اس خبر سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی ہم یہ جانتے ہیں کہ رومی اب قیامت تک سر نہیں اٹھا سکیں گے ——— ہم نے قیصر کا غرور ہمیشہ کے لیے خاک میں ملا دیا ہے لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ عرب کے ایک باشندے کو ہمارے خلاف اس قسم کی پیشگوئی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ کیا اس دنیا میں اتنے بے خبر لوگ بھی ہو سکتے ہیں، جنھیں ہماری طاقت اور ہماری فتوحات کا علم نہ ہو۔"

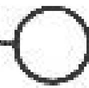
یمن کے حاکم نے کہا: "عالیجاہ! عرب کے نبیؐ نے یہ پیش گوئی اس وقت کی تھی جب کہ رومی

سلطنت میں ابھی زندگی کے چند سانس باقی تھے اور بعض لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو سکتے تھے کہ شاید جنگ کا پانسہ پلٹ جائے۔ مجھے کوئی پانچ سال قبل اس پیش گوئی کی اطلاع ملی تھی لیکن اب تو کوئی دیوانہ ہی اس پیش گوئی کو اہمیت دے سکتا ہے۔"

پرویز نے قدرے تلخ ہو کر پوچھا۔ "اگر تمہیں پانچ سال قبل اطلاع ملی تھی تو تم نے ہمیں خبر کیوں نہ دی؟"

"فاتح عالم! اگر مجھے یہ خدشہ ہوتا کہ دنیا کی کوئی طاقت آپ کو شکست دے سکتی ہے تو میں یقیناً آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ لیکن میرے نزدیک آپ کی فتوحات کے سیلاب کے سامنے اس پیشگوئی کی کیا حقیقت تھی۔ آخر یروشلم کے راہب بھی تو یہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ ایران کا لشکر یروشلم کی دیواروں تک نہیں پہنچ سکے گا۔"

کسریٰ کے بے رحم چہرے پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور یمن کا گورنر اچانک یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے سر سے ایک طوفان گزر چکا ہے۔



ظاہر بین نگاہیں رومیوں کی ذلت اور رسوائی کا آخری نقشہ دیکھ رہی تھیں۔ قسطنطین کے جانشین اس تاریک گڑھے میں دم توڑ رہے تھے جہاں سے ان کے دوبارہ اٹھنے کے امکانات ختم ہو چکے تھے۔ ہرقل کے اقبال کا آفتاب غروب ہو چکا تھا اور اس کے مقدر کی رات ان ستاروں کی جھلملاہٹ کے بغیر تھی جو تھکے ہارے مسافروں کو صبح کا پیغام دیتے ہیں لیکن اب بھی خدا کی زمین پر مٹھی بھر انسانوں کی ایک جماعت ایسی تھی۔ جن کے نزدیک ابھی تک فتح اور شکست کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ محمد عربیؐ کے یہ غلام جنہیں مشرکینِ مکہ ایرانیوں کی فتوحات کی خبریں سنا کر چڑایا کرتے تھے اپنے آقا کی زبانِ مبارک سے خالقِ ارض و سما کا یہ پیغام سن چکے تھے کہ رومیوں کی شکست بالآخر فتح میں تبدیل ہو جائے گی اور زمانے کا کوئی انقلاب اس پیشگوئی کی صداقت پر ان کا ایمان متزلزل نہیں کر سکتا تھا۔

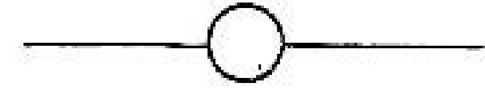
مشرکینِ مکہ کے نزدیک صرف ایرانیوں پر رومیوں کے غلبہ کی پیش گوئی ہی ناقابلِ یقین نہ تھی بلکہ اس سے کہیں زیادہ وہ اس بات پر حیران تھے کہ اس پیشگوئی کے ساتھ ہی مسلمانوں کو بھی اللہ کی بخشی ہوئی فتح کی

خوشیاں منانے کی بشارت دی گئی تھی اور خدا کے یہ بندے جس یقین کے ساتھ رومیوں کی فتح کا انتظار کر رہے تھے۔ اسی یقین کے ساتھ اپنی فتح کا انتظار کر رہے تھے پھر جس طرح کسریٰ کو رومیوں سے انتہائی ذلیل شرائط منوانے کے بعد اس بات کا خدشہ ذرہ بھر نہ تھا کہ رومی اس کی طاقت کے سامنے دوبارہ سر اٹھانے کی جرأت کریں گے۔ اسی طرح مشرکینِ مکہ کو بھی یہ بات خارج از امکان معلوم ہوتی تھی کہ بے بس انسانوں کا یہ گروہ جس پر وہ اپنے ظلم کے ترکش کے سارے تیر آزما چکے ہیں۔ عرب کے کسی میدان میں اپنی فتح کا پرچم گاڑ سکے گا۔ قیصر اپنی شکست کا اعتراف کرنے کے باوجود ایک بادشاہ تھا۔ اس گئی گزری حالت میں بھی باسفورس کے پار اس کے قلعے اور فوجی مستقر موجود تھے۔ کلیسا کی قوت اس کی پشت پر تھی اور ہزاروں انسان اس کی آواز پر لبیک کہنے کے لیے موجود تھے ——— لیکن محمد عربیؐ اور ان کے مٹھی بھر غلاموں کی حالت یہ تھی کہ انھیں اپنے گھر بار چھوڑ کر کوسوں دور پناہ لینے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

مشرکینِ مکہ اپنی قوت اور جنگی وسائل کے اعتبار سے غریب اور نادار مسلمانوں پر وہی فوقیت رکھتے تھے جو ایرانیوں کو رومیوں پر حاصل تھی اور اس وقت جب کہ وہ مکہ میں اپنے عزیزوں، دوستوں اور بھائیوں کے بے پناہ مظالم سے تنگ آ کر انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں مدینے کا رخ کر رہے تھے۔ یہ کون کہہ سکتا تھا کہ اس چھوٹے سے قافلے کا ہر قدم فتح کی منزل کی طرف اٹھ رہا ہے اور راستے کی یہ پہاڑیاں جو ان کی بے بسی کا مشاہدہ کر رہی ہیں۔ کسی دن ان کے جاہ و جلال سے لرز اٹھیں گی ——— یہ کون کہہ سکتا تھا کہ کفر کی تاریک آندھیوں سے پناہ ڈھونڈنے والے نور کا ایک ایسا سیلاب بن کر لوٹیں گے جس کی تابانیوں سے مکہ کے در و دیوار جگمگا اٹھیں گے۔ ظاہر بین آنکھوں کو عرب و عجم کا صرف ایک ہی نقشہ دکھائی دیتا تھا اور وہ یہ تھا کہ عرب کے اندر صرف اسلام کے دشمن اور عرب سے باہر صرف رومیوں کے ایرانی حریف ہی غالب رہیں گے۔ ان کے نزدیک نصرانیوں کی تقدیر مجوسیوں اور مسلمانوں کی قسمت مشرکینِ مکہ کے ہاتھ میں تھی ——— دست گرد کے مجوس کاہن اس بات پر خوشیاں منا رہے تھے کہ زردشت کا دین عیسائیت پر دائمی غلبہ حاصل کر چکا ہے اور عرب کے بت پرست اس بات پر شاداں تھے کہ ان کے لات و ہبل ایک ایسے دین کو شکست دے چکے ہیں جس کی تعلیم ان کے صدیوں کے عقائد کے منافی تھی۔ لیکن اسلام کی صداقت پر ایمان لانے والوں میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جسے اس

پیش گوئی کی صداقت پر ایمان نہ ہو ——— وہ اپنے آقا کی نگاہوں سے مستقبل کا نقشہ دیکھ چکے تھے اور حال کے آلام و مصائب کو ناقابلِ شکست حوصلوں کے ساتھ برداشت کر رہے تھے ——— دنیا میں کوئی ایسا نہ تھا جس کا حال ان سے زیادہ اذیت ناک تھا اور دنیا میں کوئی ایسا نہ تھا جو اپنے مستقبل کے متعلق ان سے زیادہ پُراُمید تھا وہ صرف یہ جانتے تھے کہ روم و ایران اور اپنے مستقبل کے متعلق ان کے آقا کی پیش گوئی کے پورا ہونے کا وقت آ گیا ہے ——— اور انھیں یہ سوچنے کی ضرورت نہ تھی کہ قدرت رومیوں کو موت کے چنگل سے چھڑا کر فتوحات کے راستے پر ڈالنے کے لیے کون سے اسباب مہیا کرے گی اور پھر یہ مختصر سا قافلہ جو انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں مکہ سے نکل کر مدینہ میں پناہ لے چکا ہے کس طاقت کے بل بوتے پر اللہ کے دین کے ان دشمنوں کو شکست دے سکے گا جو عرب قبائل میں ایک مرکزی حیثیت کے مالک تھے اور جو اسلام کو عرب کی جاہلی رسوم کا بدترین دشمن ثابت کر کے پورے ملک کو اپنے پیچھے لگا چکے تھے۔ عرب میں صرف مکہ ہی ایک ایسا شہر تھا جسے پورے ملک میں ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کا دین مشرکانہ رسومات کا مجموعہ بن کر رہ گیا تھا اور روئے زمین پر خدا کا پہلا گھر بتوں سے بھر دیا گیا تھا تاہم اس شہر کے ساتھ عربوں کی عقیدت کا رشتہ ابھی تک قائم تھا۔ وہ ہر سال حج کی رسومات ادا کرنے اور اپنے ہاتھوں کے بنائے بتوں سے منتیں ماننے کے لیے یہاں آتے تھے اور صدیوں سے بیت اللہ کی نگرانی اور حفاظت کے فرائض ادا کرنے کے بعد قبیلہ قریش کو بھی عرب قبائل میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ وہ اس جہالت کے علمبردار تھے جس کی تاریکیاں پورے عرب کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھیں۔ وہ ان مذہبی اور سیاسی عقائد کے معلم تھے جن کے باعث یہ ملک ایک اخلاقی انحطاط کی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ ان حالات میں ایک نئے دین کے خلاف ان کا نعرہ پورے عرب کو مشتعل کر سکتا تھا اور ظاہری حالات سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ جب عرب کے کسی میدان میں مسلمانوں کے ساتھ قریش مکہ کا تصادم ہو گا تو پورے عرب کی طاقت ان کی پشت پر ہو گی۔ اگر مکہ سے کوئی بگولہ اٹھا تو یثرب تک پہنچتے پہنچتے وہ ایک مہیب آندھی میں تبدیل ہو جائے گی۔ لیکن وہ قافلہ جو رات کے وقت مکہ سے نکلا تھا اور جس کی ساری پونجی ایمان کی نہ ختم ہونے والی دولت تک محدود تھی، ظاہری حالات کے تاریک پردوں کے آگے ایک ایسے مستقبل کی منازل

دیکھ رہا تھا۔ جہاں ایک نئی صبح کا آفتاب پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔



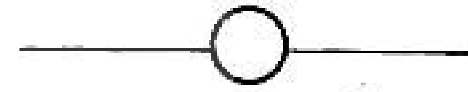
ہرقل کی افواج جنگ کے میدانوں میں پٹ چکی تھیں۔ اس کے خزانے خالی ہو چکے تھے اور اب حالات نے اسے ایک بے رحم اور مغرور دشمن کے انتہائی توہین آمیز مطالبات تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کی رعایا اس سے بددل اور مایوس ہو چکی تھی۔ اور قسطنطنیہ کے در و دیوار اس کا مذاق اڑا رہے تھے اور وہ تاج جو سلطنتِ روما کی سطوت اور جبروت کا آئینہ دار تھا اسے غلامی کے طوق سے زیادہ بدنما محسوس ہوتا تھا۔ وہ ایک ایسی کشتی کا ناخدا تھا جس کے پیندے میں سوراخ ہو چکے تھے ۔۔۔ اہلِ روم جو چند برس قبل اسے اپنا نجات دہندہ سمجھ کر اس کے راستے میں آنکھیں بچھاتے تھے اب اس کے وجود کو اپنے لیے ایک سزا سمجھتے تھے ۔۔۔ لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ روم کی ذلت اور رسوائی کا آخری منظر دیکھنے کے بعد قدرت کی وہ اَن دیکھی اور انجانی قوتیں اچانک حرکت میں آجائیں گی۔ جن کے اشاروں پر بارانِ رحمت کا نزول ہوتا ہے اور بادِ سموم سے جھلسے ہوئے بے جان صحرا سبزہ زار بن جاتے ہیں۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ ان کا کمزور، عیاش اور بے حس حکمران کسی دن اچانک خوابِ غفلت سے بیدار ہوگا اور وہ مردہ رگیں جن پر آگ کے انگارے بھی اثرانداز نہیں ہوتے، زندگی کے خون سے لبریز ہو جائیں گی۔ اگر کوئی رومی دینی نجات کے لیے ابھی تک معجزے کا منتظر تھا تو وہ بھی یہ سوچنے کے لیے تیار نہ تھا کہ قدرت کا کوئی معجزہ ہرقل کو مایوسی اور بددلی کے قبرستان سے نکال کر جیتے جاگتے انسانوں کی صف میں کھڑا کر سکتا ہے اور اہلِ روم اس کی قیادت میں کسی کامیابی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ ماضی کے واقعات نے انھیں بار بار جس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور کیا تھا وہ یہ تھی کہ روم کیلئے ہرقل کا ستارہ منحوس ہے اور اگر قدرت کو ان کی بھلائی مقصود ہے تو وہ انھیں جنگ کے کسی نئے میدان کا راستہ دکھانے سے پہلے ایک ایسے حکمران سے نجات دلانے کے اسباب پیدا کرے گی جو ماضی کے امید افزا حالات میں بھی انھیں شکست ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں دے سکا ۔۔۔

لیکن چند برس قبل مکہ کی گلیوں میں پیغمبرِ اسلام کی جس پیشگوئی کا مذاق اڑایا گیا تھا اس کے پورا ہونے کا وقت قریب آچکا تھا ۔۔۔ ہرقل اس وقت خوابِ غفلت سے بیدار ہوا جب اسے دیکھنے، جاننے اور سمجھنے والے تمام انسان مایوس ہو چکے تھے۔ اس نے اس وقت اپنی زنگ آلود تلوار اٹھانے کی جرأت کی جبکہ اس کے بازو شل ہو چکے تھے، اس نے عزت کا راستہ اس وقت اختیار کیا جب کہ روئے زمین کی ساری ذلتوں اور رسوائیوں کو ایک گٹھڑی میں باندھ کر اس کی پیٹھ پر لاد دیا گیا تھا ۔۔۔ اور اسے فتح اور نصرت کے اسباب تلاش کرنے کی اس وقت فکر ہوئی جب کہ روم کی تباہی کے تمام ظاہری اسباب مکمل ہو چکے تھے۔

کسریٰ جیسے جابر دشمن سے دوبارہ ٹکر لینے کے لیے اسے نئی افواج کی ضرورت تھی اور نئی افواج تیار کرنے کے لیے اسے وقت اور روپیہ درکار تھا۔ چنانچہ پرویز نے اسے خراج جمع کرنے کے لیے جو مہلت دی تھی اس کا ایک ایک لمحہ جنگی تیاریوں میں صرف ہونے لگا۔ دولت کی کمی پوری کرنے کے لیے اس نے سلطنت کے خالی خزانوں کی بجائے ان گرجوں اور خانقاہوں کا رخ کیا جہاں کلیسا کے اکابر سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھانا کھاتے تھے ۔۔۔ یہ لوگ اپنے خزانوں سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔ لیکن قیصر نے انھیں یہ سمجھایا کہ میں تم سے قرض مانگتا ہوں اور جب روم کے دن پھر جائیں گے تو تمھارے قرض کی رقوم تمھیں سود کے ساتھ ادا کی جائیں گی ۔۔۔ کلیسا کے اکابر کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ ایرانیوں کو خراج ادا کرنے کے بعد بھی انھیں زیادہ مدت کے لیے امن اور راحت کی زندگی نصیب نہیں ہوگی اور سونے اور چاندی کے جو ذخائر انھوں نے اپنی خانقاہوں اور گرجوں میں چھپا رکھے ہیں وہ کسی دن ایرانیوں کے ہاتھوں لوٹے جائیں گے۔ چنانچہ مذہب کے بعض پیشواؤں نے رضاکارانہ طور پر قیصر کو اپنے خزانے پیش کر دیئے اور بعض جنھوں نے تنگ دلی کا مظاہرہ کیا انھیں حکومت کے دباؤ نے صدیوں کی جمع کی ہوئی دولت سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا۔

قیصر کے لیے ایرانیوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ لڑنا ایک مجبوری تھی۔ امن کی خاطر شاید وہ اپنی رعایا کے ہاتھوں سے سوکھی روٹیاں چھین کر بھی ایرانیوں کو پیش کر دیتا۔ لیکن ایک ہزار دوشیزاؤں کا مطالبہ پورا کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اپنے ایلچیوں سے صلح کے لیے پرویز کی شرائط سننے کے بعد اس کے لیے دو ہی راستے تھے۔ اولاً یہ کہ وہ اپنی بے بس رعایا کو ایرانیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر کہیں بھاگ جاتا اور ثانیاً یہ کہ وہ زندگی اور موت سے بے پروا ہو کر اپنے طاقت ور، مغرور اور بے رحم دشمن کے خلاف سینہ سپر ہو جاتا

——— اور قیصر نے یہی راستہ اختیار کیا اور اس کی نیم جان رعایا کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ ان کے کمزور، بے بس اور عیاش حکمران کی ذہنیت کی تبدیلی کے ساتھ زمانہ بھی ایک نئی کروٹ بدل رہا ہے وہ کسان اور چرواہے جو صرف زندہ رہنے کے لیے ہر ذلت برداشت کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔ اب آزادی یا موت کے نعرے لگاتے ہوئے ہرقل کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے تھے اور وہ سپاہی جو جنگ کی صورت میں زیادہ سے زیادہ قسطنطنیہ کی حفاظت کے لیے اپنے خون کی رہی سہی پونجی لٹانے کے متعلق سوچ سکتے تھے اب اپنے سینوں میں مشرق کے ان شہروں اور قلعوں پر یلغار کرنے کا حوصلہ پاتے تھے۔ جہاں برسوں سے مجوسیت کی فتح کے پرچم لہرا رہے تھے۔ بازنطینی حکمران اور اس کی رعایا کی یہ کایا پلٹ انسانی تاریخ کا ایک ناقابلِ یقین معجزہ تھا۔



ہرقل ایک طرف نئی فوج بھرتی کرنے اور دوسری طرف بحیرۂ مارمورا اور آبنائے باسفورس میں جہاز جمع کرنے میں مصروف تھا۔ باسفورس کے دوسرے کنارے ایران کے عظیم لشکر کے خیمے اب بھی دکھائی دیتے تھے لیکن اپنی زبردست تیاریوں کے باوجود ہرقل ایرانی لشکر پر براہِ راست حملہ کرنے کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ ایسے حملے کی ناکامی کی صورت میں ایرانیوں کی جوابی کارروائی قسطنطنیہ کے لیے تباہی کا سامان پیدا کر سکتی تھی۔ اور فتح کی صورت میں بھی خشکی کے راستے مشرق کی طرف پیشقدمی کرتے ہوئے عقب میں رسد اور کمک کے طویل راستے غیر محفوظ ہو جاتے تھے۔ ایشیائے کوچک کی چوکیوں سے ایرانی لشکر کے معمولی دستے بھی ان کے لیے تباہی کا سامان پیدا کر سکتے تھے۔ ہرقل کے لیے خشکی کی بجائے سمندر زیادہ محفوظ تھا۔

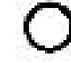
چنانچہ مکمل تیاریوں کے بعد اس نے قسطنطنیہ کی حفاظت سینٹ اور کلیسا کے اکابر کے سپرد کی اور پھر لشکر کو جہازوں پر سوار ہونے کا حکم دیا۔ رومیوں کا یہ جنگی بیڑا کسی دقت کا سامنا کئے بغیر ایشیائے کوچک کے مغربی اور جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا شام کے مغربی کونے سے قریب خلیج اسکندرونہ میں لنگر انداز ہوا اور اس کے بعد ہرقل نے اسوس کے قریب ڈیرے ڈال دیئے جہاں کسی زمانے میں سکندر اعظم نے دارا کو شکست دی تھی۔ ہرقل کا یہ اقدام خطرے سے خالی نہ تھا۔ اگر ایرانی حالات سے فائدہ اٹھانے کی

کوشش کرتے تو باسفورس کے مشرقی کنارے سے ان کی پیش قدمی قسطنطنیہ کے لیے تباہ کن ہو سکتی تھی اور ہرقل کو بذاتِ خود اس خطرے کا اس قدر احساس تھا کہ اس نے روانگی سے قبل جن لوگوں کو قسطنطنیہ کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی تھی انہیں دشمن کا مقابلہ کرنے یا بحالتِ مجبوری اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا اختیار دے دیا تھا۔ لیکن خلقدون کے آس پاس جمع ہونے والی ایرانی افواج کسی فوری اقدام کا فیصلہ نہ کر سکیں۔ اور اس کے بعد جب ہرقل کا لشکر ایک ایسے مقام تک پہنچ چکا تھا جہاں سے اس کی پیش قدمی ایک طرف آرمینیا اور دوسری طرف شام کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی تو ایرانی اپنے عقب کو غیر محفوظ سمجھ کر قسطنطنیہ پر یلغار کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔

شام اور ایشیائے کوچک کی سرحدوں کے آس پاس پہاڑی علاقوں میں ایرانی لشکر کے ساتھ چند جھڑپوں کے بعد ہرقل نے موسمِ سرما کے دوران دریائے ہیلس کے کنارے قیام کیا اور اس کے بعد قسطنطنیہ کے حالات نے اسے واپسی پر مجبور کر دیا۔ اس مہم میں ہرقل کو بظاہر کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہیں ہوئی لیکن اس کے نتائج بہت دور رس تھے۔

اس نے رومیوں کو پہلی بار یہ احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ ان کے عافیت پسند حکمران کی ذہنیت تبدیل ہو چکی ہے اور اپنی رعایا کے لیے وہ بڑے سے بڑا خطرہ مول لے سکتا ہے۔ اس مہم کے بعد ایک طرف اس کی شکست خوردہ رعایا کے دل میں نئے حوصلے بیدار ہو چکے تھے اور دوسری طرف شام اور ایشیائے کوچک میں مجوسیوں کے ظلم و استبداد کی چکی میں پسنے والے عیسائی امید کی ہلکی سی روشنی دیکھ چکے تھے۔ مفتوحہ علاقوں کے عیسائیوں نے جس جوش و خروش کے ساتھ رومی لشکر کا خیر مقدم کیا تھا، اُسے دیکھ کر ہرقل کے دل میں یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ مشرقی ممالک میں اس کی رعایا ابھی تک اسے نہیں بھولی۔ اور اگر وہ ایرانیوں کو کسی میدان میں فیصلہ کن شکست دے سکا تو یہ لوگ چاروں اطراف سے ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے تاہم ایرانیوں کے نزدیک ہرقل کی یہ مہم ایک مذاق سے زیادہ نہ تھی ——— اور جب دستگرد میں اس حملے کی اطلاع پہنچی تو مجوسی کاہن اپنے حکمران کو یہ مژدہ سنا رہے تھے کہ فاتح عالم کے ہاتھوں سلطنت روما کی مکمل تباہی مقدر ہو چکی ہے۔

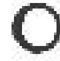
اور پھر جب رومیوں کی واپسی کی اطلاع سننے کے بعد پرویز اور اس کے مصاحب مسرت کے قہقہے لگا رہے تھے، ہرقل ایک نئی مہم کی تیاریاں کر رہا تھا۔



"ہرقل کا جنگی بیڑا بحیرۂ اسود میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کے جہاز طرابزون کے نزدیک لنگر انداز ہو چکے ہیں اور آرمینیا کے عیسائی جوق در جوق اس کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے ہیں"۔ کسریٰ پرویز کو یکے بعد دیگرے یہ ناقابلِ یقین اطلاعات پہنچیں اور پیشتر اس کے کہ وہ کسی جوابی کارروائی کا فیصلہ کر سکتا، ہرقل آذر بائیجان میں داخل ہو چکا تھا ——— پھر ایک دن اُسے یہ خبر ملی کہ ارمیاہ۔ ایران کا وہ قدیم شہر جہاں زردشت پیدا ہوا تھا، فرزندانِ صلیب کے ہاتھوں تباہ ہو چکا ہے اور وہاں ایران کے سب سے بڑے آتش کدہ کی "مقدس آگ" بجھ چکی ہے۔ مجوسیوں کے نزدیک ارمیاہ کی وہی حیثیت تھی جو عیسائیوں کے نزدیک یروشلم کی تھی۔ اور ایرانیوں کی یلغار سے قبل جس قدر عیسائی اپنے مقدس شہر کو ناقابلِ تسخیر خیال کرتے تھے، اس سے کہیں زیادہ مجوسی ارمیاہ کے دفاع کے متعلق مطمئن تھے اور اس شہر کی تباہی کے بعد مجوسیت کے علمبرداروں کے رنج و اضطراب کا وہی عالم تھا جو یروشلم کی تباہی کے بعد فرزندانِ تثلیث نے محسوس کیا تھا ——— اور ایرانی سلطنت اب انہی حالات کا سامنا کر رہی تھی جو یروشلم کی شکست کے بعد بازنطینی سلطنت کو پیش آئے تھے۔ کاتبِ تقدیر کے ہاتھ انسانی تاریخ کا ایک نیا ورق الٹ رہے تھے۔ اور تاریخ کے اس نئے ورق کی پیشانی پر ایک ایسی جنگ کی داستان بھی لکھی جا رہی تھی جو اپنے نتائج کے اعتبار سے ارمیاہ میں روم و ایران کے معرکے سے کہیں زیادہ اہم تھی ——— یہ بدر کے میدان میں ان تین سو تیرہ مسلمانوں کی جنگ اور فتح کی داستان تھی، جن کا دین صرف عرب ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے جبر و استبداد کے خلاف ایک اعلانِ جنگ تھا ——— یہ کسی قبیلے قوم یا نسل کی فتح نہ تھی۔ بلکہ اس ابدی صداقت کی فتح تھی جس کا پرچم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تھا۔

ایک طرف ہرقل کے سپاہی ارمیاہ میں ایرانیوں کی شکست پر خوشیاں منا رہے تھے اور دوسری طرف آقائے مدنی کے جاں نثار بدر کی فتح پر اپنے پروردگار کی بارگاہ میں سجدہ ریز تھے ——— اسی طرح ایک

رف ایران کے مجوسیوں اور دوسری طرف مکہ کے مشرکین کے گھروں میں ماتم بپا تھا۔ وہ پیش گوئی جس کا ...ق اڑایا گیا تھا اور جس کے خلاف مشرکینِ مکہ شرطیں بدتے تھے پوری ہو رہی تھی ——— ایران پر روم اور ...رب پر اسلام کا غلبہ شروع ہو چکا تھا۔ تاہم ایران کے مغرور حکمران کے نزدیک ارمیاہ کی شکست ایک حادثہ ...تا۔ اُسے یہ اطمینان تھا کہ رومیوں نے ابھی تک اس کے عظیم لشکر کا سامنا نہیں کیا۔ اس نے ایک لڑائی میں ناکامی ...بہ دیکھا تھا۔ لیکن فیصلہ کن معرکے ابھی پیش آنے والے تھے۔ اور یہی حال مکہ کے مشرکین کا تھا میدانِ بدر ...یں فوج کی تعداد اور اسلحہ کی برتری کے باوجود ایک عبرتناک شکست ان کے لیے تکلیف دہ ضرور تھی لیکن ...وہ یہ جانتے تھے کہ آنے والے معرکوں میں پورا عرب ان کی پشت پر ہوگا ———



ہرقل، شمال مغرب کے علاقوں کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد قزوین اور اصفہان کا رخ کر رہا تھا ...پرویز نے اس کی غیر متوقع کامیابیوں سے پریشان ہو کر مصر سے لے کر ایشیائے کوچک تک اپنی بیشتر افواج واپس بلا لیا۔ لیکن ان افواج کے اجتماع سے قبل ہرقل میڈیا اور آسریا کے کئی شہروں کو تباہ و برباد کر چکا تھا۔ دشمن کے خلاف کسی میدان میں فیصلہ کن جنگ لڑنے کی بجائے اس کی توجہ ان شہروں قلعوں یا چوکیوں کی طرف تھی جہاں اُسے کسی شدید مزاحمت کی توقع نہ تھی۔ اگر کسی میدان میں ایرانی افواج کے اجتماع کی خبر ملتی تو وہ اچانک اپنا رُخ بدل کر مہینوں کا سفر ہفتوں میں طے کرتا ہوا کسی ایسے قلعے یا مستقر پر حملہ کر دیتا، جہاں زیادہ آسانی کے ساتھ دشمن پر ضرب کاری لگائی جا سکتی تھی ———

بالآخر پرویز نے اپنی دور افتادہ چوکیوں سے جمع ہونے والے لاتعداد لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا، پہلی فوج جو پچاس ہزار آزمودہ کار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ ہرقل کا سامنا کرنے کے لیے روانہ ہوئی۔ دوسری فوج کو رومیوں کے عقب میں پہنچ کر ان کے رسد اور کمک کے راستے مسدود کرنے کا حکم ملا۔ اور تیسرا لشکر پرویز کے ایک انتہائی تجربہ کار جرنیل سرپار کی قیادت میں قسطنطنیہ پر ایک فیصلہ کن حملہ کرنے کی نیت سے خلقدون کی طرف روانہ ہوا ———

پرویز کی اس کارروائی نے ہرقل کو بحیرہ اسود کے ساحل کی طرف بھٹنے پر مجبور کر دیا۔ اور یہاں مقامی لوگ ایک اولوالعزم فاتح کی حیثیت سے اس کا خیر مقدم کر رہے تھے اور عیسائی قبائل جن کے دل میں پہلی بار مجوسیوں کے آہنی استبداد سے آزاد ہونے کی امید پیدا ہوئی تھی، جوق در جوق اس کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے تھے بحر اسود کے کنارے پڑاؤ ڈالنے کے بعد ہرقل کسی نئے حملے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اپنے عقب میں ایک زبردست جنگی بیڑے کی موجودگی کے باعث اس کے لیے رسد اور کمک کا بحری راستہ محفوظ تھا۔ لیکن ایرانی اب پوری قوت کے ساتھ حرکت میں آچکے تھے اور حالات کی تبدیلی کے بغیر اُسے کسی نئے محاذ پر کامیابی کی توقع نہ تھی۔

ایرانیوں کے مفتوحہ ممالک کے عیسائی باشندے جنہیں ہرقل کی فتوحات نے امید کی روشنی دکھائی تھی زیادہ عرصہ اطمینان کا سانس نہ لے سکے۔ ایرانی جرنیل جسے قسطنطنیہ پر ضرب لگانے کی مہم سونپی گئی تھی۔ خلقدون پہنچ چکا تھا اور اس کی پہلی کامیابی یہ تھی کہ سیتھین قبائل کا خاقان جسے رومیوں نے اس امید پر لاکھ اشرفیاں نذر کی تھیں کہ وہ ہرقل کی پیش قدمی کے دوران غیر جانبدار رہے گا۔ ایرانیوں کا حلیف بن چکا تھا۔ اور اس کے جھنڈے تلے اسی ہزار وحشی مضافات کی بستیوں کو تباہ و ویران کرنے کے بعد قسطنطنیہ کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔

روم کے دانا حکومت کو اس سے بڑا خطرہ آج تک پیش نہیں آیا تھا۔ شہر کے اکابر خاقان کو صلح پر آمادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر چکے تھے۔ لیکن ان کی التجائیں بے اثر ثابت ہو رہی تھیں۔ جب معززین شہر کا وفد خاقان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ایرانی جرنیل کے نمائندے اس کے دائیں بائیں رونق افروز تھے۔ رومی سونے اور چاندی کے تحائف لے کر گئے تھے۔ لیکن خاقان نے ان کی التجائیں سننے کے بعد انتہائی حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ "تمہاری طرف سے یہ حقیر خراج ہمیں مطمئن نہیں کر سکتا۔ ہمارے لیے صرف قسطنطنیہ کا نذرانہ قابل قبول ہو سکتا ہے۔ تمہارا حکمران اگر کہیں بھاگ نہیں گیا۔ تو وہ اب تک ایرانیوں کی قید میں ہو گا۔ قسطنطنیہ

---

۱ خاقان کا یہ لشکر آوار قبائل کے علاوہ ان روسی اور بلغاری قبائل پر مشتمل تھا۔ جو اس کے باج گزار اور حلیف تھے۔

ب ہمارے رحم و کرم پر ہے اور تم اگر پرندے بن کر ہوا میں پرواز کرنے لگ جاؤ یا مچھلیاں بن کر سمندر میں ڑبکے نہ لگا دو تو ہمارے ہاتھوں سے بچ کر نہیں جا سکتے۔"

جب روم کے ایلچی خاقان کے کیمپ سے باہر نکلے تو ان کے جسم پر اپنی قمیصوں اور زیر جاموں کے سوا کچھ نہ تھا —

اس کے بعد آوار قبائل کے پے در پے حملوں کے دس دن اہل شہر کے لیے قیامت کے دن تھے۔ وہ دبابوں کی مدد سے شہر پناہ پر کئی بار یلغار کر چکے تھے اور لکڑی کے بارہ بلند میناروں سے ان کے منجنیق بے پناہ سنگ باری کر رہے تھے۔

آبنائے باسفورس کے پار ایرانی جرنیل ایک بھوکے عقاب کی طرح اپنے نیم مردہ شکار پر جھپٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رومیوں کی قوت مدافعت جواب دے چکی تھی۔ اور وہ ولولہ جو ہرقل کی غیر متوقع کامیابیوں کے باعث بیدار ہوا تھا بتدریج سرد پڑ رہا تھا۔ اپنے حکمران کے متعلق اب انہیں یہ علم بھی نہ تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ جس تباہی کو وہ برسوں سے ٹال رہے تھے وہ ہر لحہ ان کے قریب آ رہی تھی۔

پھر ایک دن بحیرہ اسود کی طرف سے ایک جنگی بیڑا آبنائے باسفورس میں نمودار ہوا۔ اور قسطنطنیہ کی فصیلوں کے تھکے ہارے محافظ چلانے لگے۔ "ہرقل آ رہا ہے۔ خدا نے ان کی دعائیں سن لی ہیں۔" لیکن ہرقل اس بیڑے کے ساتھ نہیں تھا۔ اس نے اپنے محاذ پر موجود رہنا ضروری سمجھتے ہوئے اپنے لشکر کے بارہ ہزار جوان اہل شہر کی مدد کے لیے بھیج دیئے تھے۔ روم کے اس عظیم بیڑے نے کسی دقت کا سامنا کیے بغیر آبنائے باسفورس میں دشمن کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں تباہ کر دیں۔

آبنائے باسفورس کے پار ایرانی سپہ سالار ایک بے بس تماشائی کی حیثیت سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اور آواری جو گزشتہ حملوں میں شدید نقصانات اٹھانے کے بعد بددلی کا شکار ہو رہے تھے رومیوں کے اس غیر متوقع حملے کی تاب نہ لا سکے۔ اس کے بلغاری اور روسی حلیف مال غنیمت میں حصہ دار بننے کی امید پر جان کی بازی لگا سکتے تھے۔ لیکن اب انہیں فوری فتح غیر یقینی معلوم ہوتی تھی۔ انہیں یہ بھی شکایت تھی کہ اس جنگ میں ان کے ایرانی حلیفوں کا بال تک بیکا نہیں ہوا۔ چنانچہ خاقان نے انہیں محاصرہ اٹھانے کا حکم دیا۔ اور وہ منظم

طریقے سے پسپا ہونے لگے۔

قسطنطنیہ کی تاریخ کا ایک اور نازک لمحہ گزر چکا تھا۔ لیکن بازنطینی سلطنت کے افق پر ابھی تک تاریک آندھیاں مسلط تھیں۔ پرویز کی فوجی قوت کا اب بھی یہ عالم تھا کہ وہ پانچ لاکھ سپاہی میدان میں لا سکتا تھا۔ قسطنطنیہ سے تاتاری قبائل کی واپسی کے باوجود وہ اپنی فتح سے ناامید نہیں ہوا تھا۔ خلقدون کے پڑاؤ میں ایرانی فوج کی تعداد آئے دن بڑھ رہی تھی اور یہ فوج کسی وقت بھی ہرقل کے دارالسلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتی تھی۔ قسطنطنیہ سے سینکڑوں میل دور ہرقل کی شکست یا پسپائی رومیوں کے لیے مکمل تباہی کا پیش خیمہ ہو سکتی تھی۔ انہوں نے جو فتوحات حاصل کی تھیں وہ نقصانات کے بغیر نہ تھیں۔ اور ان نقصانات کے بعد وہ کسی میدان میں ایرانیوں کے لاتعداد لشکر کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ اس کے برعکس ایرانیوں پر گزشتہ شکستوں کا اثر ایک مہیب ہاتھی کے جسم پر چند زخموں کے اثرات سے زیادہ نہ تھا۔ ان حالات میں ہرقل کو شمال میں امید کی ایک ہلکی سی روشنی دکھائی دی۔ اس نے دریائے والگا کے اس پار وسیع میدانوں میں پھیلے ہوئے ترک قبائل کے حکمران کی طرف دوستی کا پیغام بھیجا۔ اور یہ لوگ جو خزر کہلاتے تھے اپنے خیموں اور مویشیوں سمیت جارجیا کی طرف چل پڑے۔ ان جنگجو ترکوں کے حکمران کا نام زیبل تھا۔ ہرقل نے طفلس کے قریب اس کا خیر مقدم کیا۔ اور اپنا تاج اتار کر اس کے سر پر رکھتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ تم میرے بیٹے ہو۔ پھر اس کے ساتھ آنے والے سرداروں کے لیے ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا اور انہیں اپنے ہاتھ سے قیمتی قبائیں اور سونے اور جواہرات کے تحائف تقسیم کیے۔ اس کے بعد اس نے ترکوں کے جواں سال حکمران کے ساتھ تخلیے میں ملاقات کی اور اپنی حسین بیٹی ایڈوسیہ کی تصویر دکھانے کے بعد اس کے ساتھ شادی کا وعدہ کیا۔ ——— ترک سردار اپنے حکمران کی اس غیر متوقع عزت افزائی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ان کے چالیس ہزار سوار ہرقل کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے ——— اب ہرقل کے لشکر کی تعداد مجموعی ستر ہزار سپاہیوں تک پہنچ چکی تھی۔ تاہم وہ وسطی ایران کی طرف پیش قدمی کرکے پرویز کے لاتعداد لشکر سے فوری تصادم کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھا۔ چنانچہ وہ کچھ عرصہ تک کبھی آرمینیا اور کبھی شام کی چوکیوں پر حملے کرتا رہا ——— سرباز کی قیادت میں باسفورس کے مشرقی کنارے پر ایرانی لشکر کے اجتماع نے ہرقل

ے عقب کے لیے ایک مستقل خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ ان حالات میں اس کے لیے مشرق کی طرف پیش قدمی کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ لیکن قدرت نے ایک بار پھر اس کی مدد کی۔

ایک دن پرویز کا ایلچی شہر براز[1] کے نائب کے نام یہ حکم نامہ لے کر پہنچا کہ تم اپنے بزدل اور غدار سپہ سالار کا سر اتار کر ہمارے پاس بھیج دو اور لشکر کی قیادت خود سنبھال لو۔ لیکن ایلچی نے پرویز کا یہ خط غلطی سے یا دیدہ دانستہ سرباز کے ہاتھ میں دے دیا۔ سرباز کو اپنے بے رحم آقا کے متعلق پہلے بھی کوئی خوش فہمی نہ تھی چنانچہ اس نے پرویز کی طرف سے ایک جعلی حکم نامہ تیار کیا اور اس میں فوج کے چار سو چیدہ چیدہ افسروں کے نام لکھ دیے۔ پھر اس نے اپنے افسروں کا اجلاس بلایا اور بھری مجلس میں پرویز کا حکم نامہ سنانے کے بعد اپنے نائب سے سوال کیا: "کسریٰ نے تمہیں ان چار سو افسروں کے سر قلم کرنے کا حکم دیا ہے۔ کیا تم اس کام کے لیے تیار ہو؟"

سرباز کا نائب کوئی جواب نہ دے سکا۔ اور فوج کے سرداروں نے متفقہ طور پر اپنے ظالم حکمران کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن سرباز نے ان کا جوش و خروش ٹھنڈا کرنے کے بعد کہا۔ "ہم رومیوں کے ساتھ شامل ہو کر اپنے ملک پر چڑھائی نہیں کریں گے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ہم اس جنگ میں غیر جانبدار ہو جائیں۔"[2] ایرانی سرداروں نے اپنے سپہ سالار کی یہ تجویز مان لی۔ اور سرباز نے ہرقل کو یہ پیغام بھیج دیا کہ میرے سپاہی تمہارے خلاف آئندہ کسی جنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔

---

[1] خلقدون کے ایرانی لشکر کا سپہ سالار۔

[2] بعض روایات کے مطابق یہ ایلچی پرویز کی طرف سے نہیں آیا تھا، بلکہ ہرقل نے ایرانی لشکر کو پرویز سے بدظن کرنے کے لیے ایک کامیاب سازش کی تھی۔

باب ۴۸

خدائے رحمٰن و رحیم کے نام سے

محمدؐ پیغمبر کی طرف سے کسریٰ (رئیس فارس) کے نام

سلام ہے اُس شخص پر جو ہدایت کا پیرو ہو اور خدا اور اُس کے نبی پر ایمان لائے اور یہ گواہی دے کہ خدا صرف ایک خدا ہے اور اُس نے مجھے ساری دنیا کا پیغمبر مقرر کر کے بھیجا ہے، تاکہ وہ ہر زندہ شخص کو خدا کا خوف دلائے۔ تو اسلام قبول کر تو سلامت رہے گا، ورنہ مجوسیوں کا وبال تیری گردن پر ہوگا۔

بجلاہ ایران کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خط اُس وقت ملا جب کہ وہ اپنی تمام شان و شوکت کے ساتھ دریائے کرسو کے کنارے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ شام اور آرمینیا سے اُسے رومیوں کی پیش قدمی کے متعلق تشویش ناک خبریں آ رہی تھیں، تاہم جنگ کے آخری نتائج کے متعلق اُسے کوئی پریشانی نہ تھی وہ دن کے وقت سیر و شکار سے اور رات کے وقت رقص و سرود اور مے نوشی کی محفلوں سے دل بہلاتا تھا اور اُس کے مصاحب ہر تشویش ناک خبر کے بعد اُسے یہ یقین دلانے کی کوشش کیا کرتے تھے کہ ہرقل اب ہلاکت کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ اور جب کسی کھلے میدان میں فیصلہ کن معرکہ ہوگا تو رومی لشکر کو مکمل تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور پرویز کی خود اعتمادی بلاوجہ نہ تھی۔ ایک فیصلہ کن جنگ کے لئے اُس کی محفوظ افواج کی تعداد رومیوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ میدانی علاقوں میں صرف اُس کے ہاتھیوں کی تعداد ہی ہرقل کے لشکر کو روندنے کے لئے کافی تھی۔ اس لئے وہ رومیوں کو اپنی آبائی سلطنت کی شمال مغربی

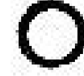
حدود سے دور روکنے کی بجائے انہیں آگے بڑھنے کا موقع دے کر کسی ایسے میدان میں گھیرنا چاہتا تھا، جہاں سے اُن کے لئے پیچھے ہٹنے کے تمام راستے مسدود ہو جائیں۔

لیکن ان حالات میں اللہ کے اُس برگزیدہ رسول نے اُس کے پاس اپنا ایلچی بھیجا تھا، جس کی ظاہری حکمرانی ابھی تک مہاجرین مکہ اور انصارِ مدینہ کے قلوب تک محدود تھی، اُسے ایک ایسے فرمانروا نے اطاعت کی دعوت دی تھی، جس کے جاں نثاروں کو پیٹ بھر کر دو وقت کا کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا تھا جس کے پاس کوئی ناقابلِ تسخیر قلعہ یا کوئی باقاعدہ فوج نہ تھی۔ اور جو مال و دولت کے اُن تمام ظاہری وسائل سے محروم تھا جو ایک انسان کو دوسرے انسان پر بالادستی عطا کرتے ہیں۔ پھر آج تک دنیا کے کسی انسان نے اپنے خط میں بجلاہ ایران کے نام سے پہلے اپنا نام لکھنے کی جسارت نہیں کی تھی۔

جب شاہی مترجم اِس خط کا مضمون سنا رہا تھا تو حاضرینِ دربار جن کے لئے یہ تحریر ایک مذاق سے زیادہ نہ تھی، بڑی مشکل سے اپنے قہقہے ضبط کر رہے تھے۔ کسریٰ کچھ دیر غصے اور اضطراب کی حالت میں قاصد کی طرف دیکھتا رہا۔ اچانک اُس نے مترجم کے ہاتھ سے حضورؐ کا نامہ مبارک چھین کر اُسے پرزے پرزے کر دیا اور یمن کے حاکم باذان کے نام یہ فرمان لکھوایا کہ نبوت کے اس مدعی کو جس نے ہمارے ساتھ مخاطب ہونے کی جسارت کی ہے گرفتار کر کے ہمارے پاس بھیج دو۔

ایران کے مغرور اور جابر حکمران کے لئے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا خط اس قدر غیر اہم تھا کہ حضورؐ کے قاصد کو سزا دینے میں بھی اُسے اپنی توہین محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ جس خط کو اُس نے چاک کیا تھا، اُس کی تحریر لوحِ محفوظ پر منتقل ہو چکی تھی۔ اور جب حضورؐ کا قاصد بے سروسامانی کی حالت میں واپس جا رہا تھا تو اُس وقت یہ کون کہہ سکتا تھا کہ اُس کے پاؤں کے نشان عنقریب اُن مجاہدوں کی گزرگاہ بننے والے ہیں جو مدینے کی گلیوں میں جہانبانی کے نئے آداب سیکھ رہے ہیں۔

پرویز اور اُس کے درباری صرف اتنا جانتے تھے کہ جب یمن کے گورنر کا ایک معمولی قاصد اہلِ مدینہ کو یہ پیغام دے گا کہ تم اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو محمدؐ کو ہمارے حوالے کر دو تو عرب کے کسی خاندان یا قبیلے کو مزاحمت کی جرأت نہیں ہوگی۔



ہرقل اور اس کے ترک اتحادیوں کے لشکر نے دریائے اراس کے آس پاس کے علاقوں میں تباہی مچانے کے بعد جنوب کی طرف پیش قدمی کی اور دجلہ کے کنارے اُس وسیع میدان میں ڈیرے ڈال دیئے، جہاں ابھی تک نینوا کے کھنڈرات دکھائی دیتے تھے۔ اِس عرصہ میں ایرانی لشکر کے سپہ سالار کو جس کی کارگزاری ابھی تک معمولی حملوں کے بعد دشمن کا تعاقب جاری رکھنے تک محدود تھی، ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کا حکم مل چکا تھا۔

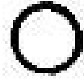
چنانچہ ایک صبح روم اور ایران کے لشکر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ پھر سواروں اور پیادوں کی صفیں حرکت میں آئیں اور نینوا کا میدان گرد و غبار کے بادلوں میں چھپ گیا۔ اس خونریز معرکے میں ہرقل کی ذاتی شجاعت اُس کے دوستوں اور دشمنوں کے لئے یکساں حیران کُن تھی، وہ جان نثاروں کے ایک دستے کے ساتھ دشمن کی صفیں چیرتا ہوا اُن کے قلب تک جا پہنچا۔ ایرانی لشکر کے سپہ سالار کے علاوہ دو مشہور سردار اُس کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ایک ایرانی کا نیزہ لگنے کے باعث اُس کا ہونٹ کٹ چکا تھا اُس کے مشہور گھوڑے کی ایک ٹانگ زخمی ہو چکی تھی تاہم وہ دشمن کا گھیرا توڑ کر واپس اپنے لشکر سے آملا۔ اور رومی جو ایرانیوں کے سپہ سالار کی ہلاکت کی خبر سنکر شیر ہو گئے تھے بے تحاشا دشمن پر ٹوٹ پڑے اور ایرانی جن کے نزدیک اپنے سپہ سالار کی موت ایک بدترین شگون تھا، سراسیمگی کی حالت میں پیچھے ہٹنے لگے۔

جب آہستہ آہستہ نینوا کے میدان سے گرد و غبار چھٹنے لگا، تو وہ جو اپنی تعداد اور اپنے اسلحہ کی برتری کو اپنی فتح کی ضمانت خیال کرتے تھے، اپنے پیچھے لاتعداد لاشیں دیکھ رہے تھے۔ اور وہ جنہیں کمزور اور حقیر خیال کیا گیا تھا، اُن کے بکھرے ہوئے پرچم روند رہے تھے۔ ایرانیوں نے کئی بار جوابی حملے کئے لیکن رومیوں کے جوش و خروش نے انہیں پاؤں جمانے کا موقع نہ دیا۔

غروب آفتاب کے وقت وہ میدانِ کارزار سے ایک طرف ہٹ کر از سرِ نو صفیں باندھ رہے تھے جنگ کے میدان میں تلواروں کی جھنکار اور لڑنے والوں کے نعروں کی بجائے دم توڑنے والے زخمیوں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ رومیوں کو اب بھی اس بات کا یقین تھا کہ ایرانی راہ فرار اختیار کرنے کی بجائے

پھر قسمت آزمائی کریں گے لیکن جب آسمان پر ستاروں کا قافلہ نمودار ہونے لگا تو کسریٰ کی شکست خوردہ فوج اچانک اپنے پڑاؤ کی طرف ہٹنے لگی۔ ہرقل کے سپاہی رات بھر جنگ میں کام آنے والے ساتھیوں کی لاشیں دفن کرنے اور زخمیوں کی مرہم پٹی میں مشغول رہے اور علی الصباح انہیں یہ معلوم ہوا کہ دشمن کا پڑاؤ خالی ہو چکا ہے۔ تھکے ہوئے رومیوں کو اس غیر متوقع فتح کے بعد آرام کی ضرورت تھی لیکن انہوں نے دشمن کا پیچھا کرنا زیادہ ضروری خیال کیا۔

رومی لشکر پہلی بار آسریا کے زرخیز میدانوں میں فتوحات کے جھنڈے گاڑتا ہوا آگے بڑھا۔ چند دن بعد دست گرد کا عظیم شہر ایک عبرتناک تباہی کا سامنا کر رہا تھا۔ شاہی محل آگ کا ایک مہیب الاؤ نظر آتا تھا اور پرویز جو رومیوں کی آمد سے نو دن قبل وہاں سے رفوچکر ہو چکا تھا، مدائن کا رُخ کر رہا تھا۔



ایک دن یمن کے ایرانی گورنر باذان کے دربار میں سرکاری عہدہ داروں کے علاوہ چند مقامی عرب اور یہودی رؤسا جمع تھے۔ ایک فوجی افسر اندر داخل ہوا اور اس نے مسند کے قریب پہنچ کر کہا۔ "جناب والا! مدینہ سے ہمارے ایلچی واپس آگئے ہیں اور آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتے ہیں۔"

باذان نے قدرے مضطرب ہو کر کہا۔ "انہیں فوراً حاضر کرو۔"

افسر ادب سے سلام کرنے کے بعد واپس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد دو آدمی جن میں سے ایک کا نام بابویہ اور دوسرے کا خرخسرو تھا، کمرے میں داخل ہوئے اور آداب بجا لانے کے بعد سہمی ہوئی نگاہوں سے باذان کی طرف دیکھنے لگے۔

باذان نے کہا۔ "تمہاری صورتیں بتا رہی ہیں کہ تمہیں اپنی مہم میں کامیابی نہیں ہوئی۔"

بابویہ نے جواب دیا۔ "عالیجاہ یہ درست ہے کہ ہمیں اپنی مہم میں کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن آپ کا یہی حکم تھا کہ اگر ہماری دھمکیاں بے اثر ثابت ہوں تو ہمیں اس نبی کے حامیوں کے ساتھ الجھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔"

باذان نے سوال کیا "تم نے اس سے یہ کہا تھا کہ ہم تمہیں شہنشاہِ عالم کے حکم سے گرفتار کرنے آئے ہیں ــــــ؟"

بابویہ نے جواب دیا "ہاں، عالیجاہ! ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر تم نے اِس حکم کی تعمیل نہ کی تو ہمارے شہنشاہ کا ایک اشارہ پورے عرب کی تباہی کے لئے کافی ہوگا۔"

"پھر اُس نے کیا جواب دیا؟"

بابویہ نے پریشانی اور اضطراب کی حالت میں اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد جواب دیا۔ "عالیجاہ آپ کا غلام بھرے دربار میں اُس کے الفاظ دہرانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔"

باذان نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "ہم اُس کے الفاظ سننا چاہتے ہیں۔"

بابویہ نے جھجکتے ہوئے جواب دیا "عالیجاہ اُس نے یہ کہا تھا کہ تم ہماری طرف سے یہ پیغام لے جاؤ کہ مسلمانوں کی حکومت عنقریب کسریٰ کے پایۂ تخت تک پہنچنے والی ہے۔"

دربار میں ایک سناٹا چھا گیا۔ پھر حاضرین آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے اور اُن کی حقارت آمیز مسکراہٹیں قہقہوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ لیکن باذان ایک غیر متوقع سنجیدگی کے ساتھ اپنے ایلچیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اہلِ دربار کو اُس کی حوصلہ شکن نگاہوں نے زیادہ دیر ہنسنے کا موقع نہ دیا۔ اور دربار میں پھر ایک بار سناٹا چھا گیا۔

باذان نے ایلچیوں سے مخاطب ہو کر کہا "تم نے مدینہ کے سرکردہ لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش نہیں کی کہ شہنشاہ کا عتاب اُن کے لئے عبرت ناک تباہی کا باعث ہوگا۔"

بابویہ نے خرخسرو کی طرف دیکھا اور اُس نے جواب دیا۔ عالیجاہ جو لوگ اِس نبی کی صداقت پر ایمان لا چکے ہیں، اُن پر ہماری باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اِس بات پر خوشیاں منا رہے تھے کہ اُن کی حکومت ایران تک پہنچنے والی ہے۔ ہمیں زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ جب اُس نے بھری مجلس میں یہ اعلان کیا تو کسی نے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ ہم کس قوت کے بل بوتے پر روئے زمین کی عظیم ترین سلطنت پر فتح حاصل کریں گے۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر وہ یہ دعویٰ کر دے کہ میں آسمان کے ستارے توڑ

کر تمہارے سامنے ڈھیر کر سکتا ہوں تو بھی کوئی یہ سوال کرنے کی جرأت نہیں کرے گا کہ آپ کے ہاتھ ستاروں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔"

بابویہ نے کہا۔ "عالیجاہ! ہم نے انہیں مرعوب کرنے کے لئے اپنے لاتعداد لشکر اور اپنے مہیب ہاتھیوں کا ذکر کیا، لیکن اُن کی باتوں سے ہمیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ انہیں بھیڑ بکریوں سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے اُن کے بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کی ایک ہی آواز ہے کہ ہم خدا کی زمین پر اُس کے نبی کے دین کا بول بالا کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، اور جب ہمارا ہادی ہمیں جہاد کا حکم دے گا تو دُنیا کی کوئی طاقت ہمارا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔"

باذان نے پوچھا۔ "تم نے مدینہ کے مسلمانوں سے یہ نہیں پوچھا کہ تمہارے ہاتھیوں، گھوڑوں اور اسلحہ خانوں کی تعداد کیا ہے اور ایران فتح کرنے کے لئے تم نے جو سپاہی تیار کئے ہیں۔ وہ کہاں ہیں؟"

بابویہ نے جواب دیا۔ "عالیجاہ! ہمیں یہ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہم اپنی آنکھوں سے اُن کی غربت کا نظارہ دیکھ آئے ہیں، ہم نے اُن کے آقا کو کھجور کی چٹائی پر آرام کرتے دیکھا ہے۔ اور ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ اہلِ مکہ نے دوسری جنگ میں انہیں شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اور اب اگر قریش کے ساتھ چند اور قبائل متحد ہو گئے تو مسلمانوں کے لئے عرب کی زمین میں سانس لینا ناممکن ہو جائے گا۔ واپسی پر نخلہ اور طائف کے مقامات سے گزرتے ہوئے ہمیں اِس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ عربوں کے سینے میں مسلمانوں کے خلاف غصے اور نفرت کی جو آگ سلگ رہی ہے اُسے مسلمانوں کے گھروں تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی۔ ہم یثرب کے یہودیوں سے بھی ملے تھے اور ہمیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مدینہ سے مسلمانوں کے اخراج کے لئے تنہا اُن کی طاقت بھی کافی ہے۔"

باذان نے کہا "میں تم سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر ہم مسلمانوں کے نبی کو گرفتار کرنے کے لئے سواروں کا ایک دستہ مدینہ بھیج دیں تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

بابویہ نے جواب دیا "عالیجاہ! مجھے یقین ہے کہ راستے کے تمام قبائل اور مدینہ کے یہودی ہمارا ساتھ دیں گے۔ لیکن مسلمان اپنے نبی کی خاطر جان دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔"

"تمہارا یہ خیال ہے کہ وہ ہماری اور ہمارے حلیفوں کی طاقت سے قطعاً مرعوب نہیں ہوں گے؟"

"ہاں عالیجاہ! یہ لوگ اپنے خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔"

ایک یہودی نے کہا۔ "اگر یہ گستاخی نہ ہو تو میں کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

"کہو ۔۔۔!"

"عالیجاہ! میرے نزدیک یہ باتیں ایک مذاق سے زیادہ نہیں۔ آپ مدینہ میں چند مسلح سپاہی بھیج کر دیکھ لیں، مجھے یقین ہے کہ مدینہ کے کسی ذی شعور انسان کو مزاحمت کی جرأت نہیں ہو گی۔ مسلمان جس بے چارگی کی حالت میں مکہ سے نکالے گئے تھے، اُس سے زیادہ بے چارگی کی حالت میں وہ مدینہ سے بھاگیں گے۔"

ایک عرب رئیس نے کہا۔ "عالیجاہ! مسلمانوں کو اگر اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو بھی وہ آپ کے لئے کسی خطرے کا باعث نہیں ہو سکتے۔ اس وقت ہم صرف کسریٰ کی فتح اور ہرقل کی شکست کی خوشخبری سننا چاہتے ہیں۔ نینوا کی جنگ کے متعلق جو اطلاعات یہاں پہنچی ہیں، اُن سے آپ کی رعایا بہت پریشان ہے۔"

باذان نے کہا۔ "تم ہماری رعایا کو یہ تسلی دے سکتے ہو کہ ہرقل جس قدر آگے بڑھے گا، اُسی قدر اُس کی تباہی کے اسباب مکمل ہوتے جائیں گے۔ اگر اُس نے دستگرد کی طرف پیشقدمی کا ارادہ بدل نہ دیا تو تم عنقریب اُس کی عبرتناک شکست کی خبر سنو گے۔"

بابویہ نے کہا۔ "عالیجاہ! مدینہ کے مسلمانوں کی سادگی کا یہ عالم ہے کہ نو برس گزر جانے کے بعد بھی اِس مضحکہ خیز پیش گوئی پر اُن کا ایمان متزلزل نہیں ہوا کہ اِس جنگ کا آخری نتیجہ رومیوں کے غلبہ کی صورت میں ظاہر ہو گا۔ ان لوگوں کے سامنے جب ہم اپنی فوجی قوت کا ذکر چھیڑتے تھے تو وہ سب یہی کہتے تھے کہ اُن کے نبی کی پیش گوئی کے پورا ہونے کے دن قریب ہیں۔"

ایرانی افسر غضب ناک ہو کر بابویہ کی طرف دیکھنے لگے، اور باذان نے اپنا اضطراب چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اگر سپاہیوں کی تلواریں کسی جنگ کا فیصلہ کر سکتی ہیں تو میں تمہیں یہ اطمینان دلا سکتا ہوں کہ رومیوں کی قسمت کا فیصلہ ایرانی سپاہیوں کی تلواروں سے لکھا جائے گا۔ لیکن اگر ہمارے خلاف کوئی اَن دیکھی اور اَن جانی قوت میدان میں آ چکی ہے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

ایک یہودی نے کہا۔ "ہمیں ایک ایسے نبی کی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ جس کے متبعین پھر یہ مدینہ میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

باذان کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن ایک نوجوان بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اُس نے بلند آواز میں کہا۔ "عالیجاہ! مدائن سے قاصد آئے ہیں اور وہ اسی وقت باریابی کی اجازت چاہتے ہیں۔"

تین آدمی جن کی قبائیں گرد سے اَٹی ہوئی تھیں، دروازے کے سامنے نمودار ہوئے اور پہریداروں کے احتجاج سے بے پروا ہو کر اندر چلے آئے۔ ایک نوجوان نے جس کے ہاتھ میں ایک مراسلہ تھا، مسند کے قریب پہنچ کر کہا۔ "حضور! ہم اِس گستاخی کے لئے معذرت چاہتے ہیں۔ لیکن ہمارے لئے کسی تاخیر کے بغیر آپ کی خدمت میں حاضر ہونا ضروری تھا۔ ہم مدائن سے ایک اہم پیغام لے کر آئے ہیں، یہ لیجئے!"

باذان نے اپنا ہاتھ بڑھا کر مراسلہ پکڑتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ مدائن سے تم کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آئے۔"

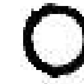
قاصد نے سر جھکا دیا۔ باذان نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے مراسلہ کھولا اور حاضرین دیر تک سکتے کے عالم میں اُس کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھتے رہے۔ بالآخر اُس نے ایک لمبی سانس لینے کے بعد حاضرینِ مجلس کی طرف دیکھا اور کہا۔ "مسلمانوں کے نبی کی پیش گوئی پوری ہو چکی ہے۔ دستگرد تباہ ہو چکا ہے۔"

دربار میں چند ثانئے ایک سکوت طاری رہا۔ بالآخر یمن کے مجوسی کاہن نے جو باذان کے دائیں ہاتھ رونق افروز تھا کہا۔ "یہ خبر بہت بُری ہے، لیکن دستگرد کے فتح ہو جانے سے، ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ فیصلہ کن جنگ مدائن کی گلیوں میں لڑی جائے گی اور ہمارا شہنشاہ دشمن کو ایک عبرتناک شکست دینے کے بعد قسطنطنیہ کے محلات تک قیصر کا پیچھا کرے گا۔"

باذان نے کہا۔ "ایران کا وہ شہنشاہ جس کا نام پرویز تھا! مر چکا ہے۔ اور تمہارے نئے حکمران کا نام شیرویہ ہے۔"

پھر وہ قاصد سے مخاطب ہوا۔ "یہ خط بہت مختصر ہے، اس لئے میں تمہاری زبان سے ساری تفصیلات سننا چاہتا ہوں۔"

قاصد نے باذان کے حکم کی تعمیل کی اور حاضرین دم بخود ہو کر دستگرد کی تباہی اور پرویز کے عبرت ناک انجام کی تفصیلات سننے لگے۔



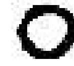
یہ واقعات جس قدر ناقابلِ یقین تھے اُسی قدر عبرت ناک تھے۔ پرویز کو نینوا کی شکست کے بعد دستگرد کی طرف ہرقل کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو اس کے خوف و اضطراب کا یہ عالم تھا کہ وہ رومیوں کی آمد سے نو دن قبل اپنے وزیروں اور جرنیلوں سے مشورہ کئے بغیر رات کے وقت ایک چور دروازے سے نکل کر مدائن کی طرف چل دیا۔ اُس کی سراسیمگی کا یہ عالم تھا کہ شاہی حرم کی تین ہزار عورتوں میں سے شیریں اور صرف تین لونڈیاں اُس کے ساتھ تھیں۔ باقی رات اُس نے دستگرد سے کچھ فاصلے پر ایک کسان کے جھونپڑے میں گزاری، تیسرے دن وہ مدائن میں داخل ہُوا اور اِس کے بعد اُسے اپنی افواج اور اپنے خزانے جمع کرنے کی فکر ہُوئی۔

دستگرد کی فوج نے اپنے بزدل حکمران کی اطاعت سے زیادہ رومیوں کے خوف کے باعث اُس کے احکام کی تعمیل کی۔ اور افراتفری کے عالم میں جو خزانہ اُن کے ہاتھ لگا اُس کو لے کر مدائن کی طرف چل پڑی۔ شاہی حرم کی تین ہزار کنیزیں بھی مدائن کے قریب ایک قلعے میں پہنچا دی گئیں۔

قیصر کا لشکر ایک آتشیں طوفان کی طرح دستگرد پر نازل ہُوا۔ اور کسریٰ کے محلات آگ کے مہیب الاؤ دکھائی دینے لگے۔ دستگرد میں رومی فوج کے حصّہ کا بیشتر کام ہرقل کی آمد سے پہلے ختم ہو چکا تھا۔ وہ ہزاروں غلام جنہیں مغرب کے مفتوحہ ممالک سے ہانک کر دستگرد میں جمع کیا گیا تھا اور جو برسوں سے انتہائی بے چارگی کی حالت میں یومِ حساب کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے ایرانی لشکر کے نکلتے ہی شہر میں لوٹ مار اور قتل و غارت کا طوفان بپا کر دیا۔ جب ہرقل کا لشکر شہر میں داخل ہُوا تو اس کی گلیوں اور بازاروں میں اُن بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی لاشیں بکھری ہُوئی تھیں، جنہیں اپنے عیسائی غلاموں سے بچ کر بھاگنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایرانی دستگرد کی بیشتر دولت نکال کر لے گئے تھے۔ لیکن اس کے

باوجود جو سونا اور چاندی[1] ہرقل کے ہاتھ لگا وہ اُس کی توقع سے کہیں زیادہ تھا۔ دستگرد کے آتشکدے زمین بوس کرنے اور شاہی محلات کو آگ لگانے کے بعد ہرقل نے مدائن کا رُخ کیا۔ لیکن اس عرصہ میں ایرانیوں کو سنبھلنے کا موقع مل چکا تھا۔ مشرقی علاقوں کی افواج ساسانیوں کے قدیم دارالحکومت کو بچانے کے لئے جمع ہو رہی تھیں۔ مدائن کے قریب پہنچ کر ہرقل کو اس بات کا احساس ہونے لگا کہ اُس کا لشکر کئی ہفتوں کی مسلسل بے آرامی کے باعث نڈھال ہو چکا ہے اور اس حالت میں اُس کے لئے ایران کے اُس عظیم شہر پر یلغار کرنا خطرے سے خالی نہیں، جس کے باشندے فوج کی اعانت کے بغیر بھی کئی دن تک اُس کے لشکر کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ دستگرد میں اسے جو غیر متوقع کامیابی حاصل ہوئی تھی، اُس کی وجہ پرویز کی بزدلی تھی۔ لیکن مدائن کی آبادی پر پرویز سے زیادہ اُن مغرور سرداروں اور مجوسی کاہنوں کا اثر تھا جو اِس کی بقا اور سلامتی کو پورے ایران کی بقا اور سلامتی کا مسئلہ سمجھتے تھے اور جن کی قدیم روایات سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے حکمران کو بزدلی اور بے غیرتی کا ایک اور مظاہرہ کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ ہرقل اتنی عظیم فتوحات کے بعد کسی ناکامی یا شکست کا معمولی خطرہ مول لینے کے لئے بھی تیار نہ تھا۔ چنانچہ اُس نے مزید تیاریوں کے بعد ایران پر آخری ضرب لگانے کی نیت سے اپنے لشکر کو واپسی کا حکم دیا۔ اب اُس کی منزلِ مقصود تبریز کا علاقہ تھا، جہاں پڑاؤ ڈال کر وہ اطمینان کے ساتھ ایک نئے حملے کے لئے تیاریاں کر سکتا تھا۔ جب وہ آسریا کے میدانوں سے نکل کر پہاڑی علاقوں میں داخل ہُوا تو برف باری شروع ہو چکی تھی، لیکن فاتح لشکر نے قریباً پانچ ہفتے انتہائی عزم اور استقلال کے ساتھ برف باری کے شدید طوفانوں میں اپنا سفر جاری رکھا اور تبریز کے قریب ڈیرے ڈال دیئے۔

[1] ہرقل نے دستگرد کا مالِ غنیمت بحیرہ اسود کے راستے قسطنطنیہ روانہ کیا تھا، لیکن وہ جہاز جس پر یہ سونا اور چاندی لادا گیا تھا، طوفان کے باعث سمندر میں غرق ہو گیا



مدائن میں پرویز کی فوج اور رعایا کو ایک فوری خطرے نے اپنے حکمران کے جھنڈے تلے جمع کر دیا تھا لیکن اب یہ خطرہ ٹل چکا تھا اور یہ لوگ انتہائی نفرت اور حقارت کے ساتھ اُس حکمران کی طرف دیکھ رہے تھے، جس کی بزدلی اور بے تدبیری نے ایران کی عظیم ترین فتوحات کو عبرت ناک شکستوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ نوشیرواں کا پوتا اب وہ دیوتا نہیں تھا، جس کی سلامتی، عزت اور اقبال کے لئے ایران کے آتشکدوں میں دعائیں مانگی جاتی تھیں، بلکہ ایک ایسا انسان تھا جس کی نحوست سے نجات حاصل کرنا اہلِ ایران کے لئے وقت کا ایک اہم ترین مسئلہ بن چکا تھا۔ مدائن کی گلیوں اور بازاروں میں صبح و شام اِس قسم کے نعرے سنائی دیتے تھے۔ پرویز سین کا قاتل ہے۔ پرویز نینوا کی شکست اور دست گرد کی تباہی کا ذمہ دار ہے۔ سرباراور اُس کے لشکر نے پرویز کی شرمناک سازشوں سے تنگ آکر جنگ سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ ایران کے لاکھوں جوان جنگ میں کام آ چکے ہیں، اب ہم ایک سفاک بادشاہ کی تسکین کے لئے مزید خون مہیا نہیں کر سکتے۔ ایران کو امن کی ضرورت ہے۔ سین ہرقل کی طرف سے صلح کی پیش کش لے کر آیا تھا لیکن پرویز نے اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہمارا دشمن ہرقل نہیں پرویز ہے۔ رومی نئے حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور اب اُن کے ساتھ مصالحت کی یہی صورت ہے کہ ہم پرویز سے نجات حاصل کر لیں۔

پرویز سے عوام کے جذبات پوشیدہ نہ تھے، وہ جانتا تھا کہ اب اُس کی تباہ حال رعایا اُسے نفرت اور حقارت کے سوا کچھ نہیں دے سکتی۔ اپنے حال کے متعلق اُس کی پریشانی اور مستقبل کے متعلق مایوسی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، اُس کے ذہنی اور جسمانی قویٰ مفلوج ہو چکے تھے۔ اب اُسے شراب کے نشے میں بھی اُن لوگوں کی چیخیں سنائی دیتی تھیں، جو اُس کے حکم سے تختہ دار پر کھینچے گئے تھے۔

بالآخر ایک دن اُس نے اپنے اُمراء کو بلایا اور اُن کے سامنے اپنے عزیز ترین بیٹے مردزا کے سر پر تاج رکھنے کی خواہش ظاہر کی، لیکن اُمراء کے نزدیک ایک شکست خوردہ بادشاہ کے حکم کی ہر خواہش بے معنی تھی۔ اُن کے ایک بااثر گروہ نے پرویز کے ایک اور بیٹے شیرویہ کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر لیا۔ یہ

نوجوان جو اپنے باپ سے کہیں زیادہ سفاک تھا۔ ایران کے تخت و تاج کو اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا اُس نے امراء کو انعامات اور سپاہیوں کو زیادہ تنخواہوں کا لالچ دیا، اور ایک طویل جنگ کے آلام و مصائب سے دل برداشتہ عوام کو یہ مژدہ سنایا کہ میں تمہیں امن دوں گا۔ کسریٰ کو اُس وقت ہوش آیا، جب شیرویہ کی سازش کامیاب ہو چکی تھی اور مدائن کے سپاہی، امراء اور عوام اُسے اپنا بادشاہ تسلیم کر چکے تھے۔ پرویز نے بھاگنے کی کوشش کی، لیکن سپاہیوں نے اُسے مدائن کے دروازے سے باہر نکلنے کا موقع نہ دیا اور پکڑ کر شیرویہ کے سامنے لے آئے۔

شیرویہ نے اپنے باپ کی آنکھوں کے سامنے یکے بعد دیگرے اپنے اٹھارہ[1] بھائیوں کے سر قلم کرا دیئے اور اس کے بعد اُسے مدائن کے قید خانے کی ایک تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ اور اِس تاریک کوٹھڑی میں کجکلاہِ ایران کی حالت اُس شخص کی سی تھی، جسے جیتے جی قبر میں اتار دیا گیا ہو۔ اپنی زندگی میں ہزارہا بے گناہ انسانوں کو جو اذیتیں اُس نے پہنچائی تھیں وہ اُسے اپنے بیٹے کے ہاتھوں پہنچ رہی تھیں۔ بھوک اور پیاس کی حالت میں اُسے اپنی التجاؤں، چیخوں اور سسکیوں کے جواب میں صرف اپنی آواز سنائی دیتی تھی۔ رُوئے زمین کا انتہائی بااختیار، انتہائی مغرور اور انتہائی ظالم انسان اب اپنی بے بسی، عجز اور مظلومیت کی انتہا دیکھ رہا تھا۔

شیرویہ نے اپنے باپ کو زندگی کے عذاب سے نجات دلانے کے لئے پانچ دن کسی موزوں قاتل کی تلاش میں گزار دیئے، بالآخر اُسے ہرمز نامی ایک نوجوان نے جس کے باپ کو پرویز نے قتل کر دیا تھا۔ اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے کہا: "ایک بیٹے کے لئے اپنے باپ کے قاتل سے انتقام لینا جائز اور درست ہے۔"

شیرویہ نے جواب دیا: "تم اپنے باپ کا انتقام لے سکتے ہو۔"

ہرمز قید خانے میں داخل ہوا اور تھوڑی دیر بعد ایک کوٹھڑی سے ایران کے تاجدار کی آخری چیخ

---

[1] بعض روایات کے مطابق شیرویہ کے ہاتھوں پرویز کے قتل ہونے والے بیٹوں کی تعداد پندرہ تھی۔

سنائی دی۔ پھر تھوڑی دیر بعد قاتل اپنی خون آلود قبا تبدیل کئے بغیر شیرویہ کے سامنے کھڑا یہ کہہ رہا تھا۔" عالیجاہ! آپ کے حکم کی تعمیل ہو چکی ہے۔ میں اپنے باپ کا انتقام لے چکا ہوں۔"

شیرویہ کے چہرے پر ایک خوفناک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور اُس نے کہا۔" تم اپنے باپ کے قاتل سے انتقام لے چکے ہو۔ لیکن میں نے ابھی تک اپنے باپ کے قاتل سے انتقام نہیں لیا۔"

ہرمز کے چہرے پر اچانک موت کی زردی چھا گئی۔ اور وہ چلایا۔" عالیجاہ! میں نے صرف آپ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔"

شیرویہ نے مسلح پہرہ داروں کی طرف اشارہ کیا اور انہوں نے آگے بڑھ کر ہرمز کو گھیرے میں لے لیا پھر چار آدمیوں کی تلواریں بلند ہوئیں۔ ایک چیخ سنائی دی اور اس کے بعد ایک لاش شیرویہ کے قدموں میں تڑپنے لگی۔

باب ۴۹

دست گرد کے قید خانے میں دو سال گذارنے کے بعد عاصم نے اپنی اسیری کے دنوں، ہفتوں کا حساب رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ قید کے ابتدائی ایام میں اس کے ساتھ تورج اور مہرداد کی ملاقات کا یہ اثر ہوا تھا۔ کہ قید خانے کا داروغہ اسے پہلے سے بہتر سلوک کا مستحق سمجھنے لگ گیا تھا اس کے بعد سین کے ساتھ عقیدت رکھنے والے چند اور فوجی افسروں نے بھی داروغہ کی وساطت سے اس کے ساتھ درپردہ ملاقاتیں کی تھیں۔ اور ان کے طرزِ عمل نے داروغہ کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اگر کبھی حالات نے پلٹا کھایا تو فوجی سرداروں کا ایک بااثر گروہ جو سین کو مظلوم سمجھتا ہے اس شخص کو فراموش نہیں کرے گا جو سین کا وفادار دوست یا ساتھی ہونے کے جرم کی سزا بھگت رہا ہے۔ چنانچہ وہ عاصم کے ساتھ عام قیدیوں کی نسبت زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ اور چند ملاقاتوں کے بعد اس کی دلچسپی ایک گہرے انس میں تبدیل ہونے لگی ——

ابتدا میں وہ دست گرد کے عوام کی طرح سین کی المناک موت کو ایک غدار کی موت سمجھتا تھا۔ لیکن عاصم کی باتیں سننے کے بعد اس کے خیالات یکسر تبدیل ہو چکے تھے اور وہ عاصم پر اور زیادہ مہربان ہو چکا تھا۔ تاہم اس کا نیک سلوک عاصم کے آلام و مصائب کا علاج نہ تھا۔ ماضی کی تمام یادوں سے کنارہ کش ہو کر اور مستقبل کی تمام امیدوں سے زندگی کے رشتے توڑ کر ایک قیدی کے حال پر قانع ہو جانے کا تصور بھی اسے ناقابلِ برداشت محسوس ہوتا تھا۔ ایک دن اس کی کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ اور قید خانے کے داروغہ نے اندر داخل ہو کر کہا۔" مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے دو دن سے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا۔"

عاصم نے بے اعتنائی سے اس کی طرف دیکھا اور جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

داروغہ نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری صحت خراب ہو رہی ہے۔ اور میں نے آئندہ تمہیں اپنے گھر سے کھانا بھجوانے کا انتظام کیا ہے۔"

عاصم نے داروغہ کی طرف گھور کر دیکھا اور کہا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ جیسا بدنصیب اگر چند مہینے یا چند برس اور اس کوٹھڑی میں ایڑیاں رگڑتا رہے تو آپ کو اس سے کیا حاصل ہوگا؟"

داروغہ نے جواب دیا۔ "یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں تمہاری صحت کا خیال رکھوں۔ آج سے تمہیں صبح و شام قید خانے کی چار دیواری کے اندر کھلے بندوں گھومنے پھرنے کی اجازت ہوگی۔"

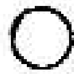
عاصم کی آنکھوں میں اچانک امید کی روشنی جھلکنے لگی۔ لیکن داروغہ نے اچانک اپنا لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اس رعایت سے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ اس قید خانے میں تین سو آدمی ایسے ہیں جو شہنشاہ کے حکم سے یہاں لائے گئے ہیں اور جنہیں صرف کسریٰ کے حکم سے رہا کیا جا سکتا ہے۔ ان قیدیوں کی اکثریت ایران کے ان بااثر خاندانوں سے تعلق رکھتی ہے جن سے حکم عدولی یا بغاوت کا خدشہ ہو سکتا تھا۔ شہنشاہ کو اس بات کا یقین ہے کہ جب تک یہ لوگ قید میں ہیں اور جب تک ان کے دوستوں، عزیزوں یا رشتہ داروں کو یہ خوف دلایا جا سکتا ہے کہ ان کی قید کو ہر وقت موت کی سزا میں تبدیل کیا جا سکتا ہے وہ بغاوت کی جرأت نہیں کریں گے۔ مجھے ان قیدیوں کی صحت اور سلامتی کے علاوہ یہ ذمہ داری بھی سونپی گئی ہے کہ جب کسریٰ انہیں یاد فرمائے گا تو میں انہیں حاضر کر دوں اور اگر مجھے اس ذمہ داری کے قابل سمجھا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے پانچ بچے ہیں اور مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اگر میری غفلت یا کوتاہی کے باعث کوئی قیدی فرار ہو جائے تو ان پانچ بچوں کو میری آنکھوں کے سامنے ذبح کر دیا جائے گا۔ اور ان کے علاوہ میرے تمام عزیزوں اور دوستوں کو بھی بدترین سزاؤں کا مستحق سمجھا جائے گا۔ میں اگر تمہیں اس قید خانے میں گھومنے پھرنے کی رعایت دے رہا ہوں تو اس کی وجہ میرا یہ اطمینان ہے کہ تم اپنی آزادی کے بدلے میرے بال بچوں اور عزیزوں کی زندگیاں خطرے میں ڈالنا پسند نہیں کرو گے۔ پھر مجھے یہ اطمینان بھی ہے کہ اگر تم فرار ہونے کی کوشش بھی کرو تو بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ عاصم! تمہیں اپنے مستقبل کے متعلق اس قدر ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ کسریٰ نے پہلی بار میدان جنگ میں چند ناکامیوں کا سامنا کیا ہے۔ ممکن ہے کہ رومیوں

کی مزید کامیابیوں سے وہ ایسی شرائط پر صلح کرنے کے لیے آمادہ ہو جائے جو ان کے لیے قابلِ قبول ہوں۔ اس صورت میں اگر رومیوں نے تمہاری خدمات کا لحاظ کیا تو ان کے لیے تمہاری رہائی کا مطالبہ منوانا مشکل نہیں ہوگا ——— یہ بھی ممکن ہے کہ جنگ کی طوالت سے تنگ ہوتے سپاہیوں کے اضطراب کے باعث ایران کو کسی اندرونی انقلاب کا سامنا کرنا پڑے اور یہیں کا کوئی دوست تمہارے لیے اس قید خانے کا دروازہ کھول دے۔ تم نے ایک دن عرب کے کسی نبیؐ کی پیش گوئی کا ذکر کیا تھا۔ اور ارمیاہ کی تباہی کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا زمانہ قریب آ رہا ہے۔ تمہیں حوصلے سے کام لینا چاہیے ——— میں تمہارے لیے کھانا بھیجتا ہوں۔"

داروغہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا اور عاصم کو پھر ایک بار دست گرد کے قید خانے سے کوسوں دور نئے راستوں اور نئی منزلوں کے چراغ دکھائی دینے لگے۔

"فسطینہ! فسطینہ!!" اس نے اپنے دل میں کہا۔ "کیا تم میرا انتظار کر سکو گی ———؟ اور پھر یکایک اس کے تصورات کی دنیا میں فسطینہ کی مسکراہٹیں پھیل گئیں۔

اس شام وہ قید خانے کی وسیع چار دیواری کے اندر گھوم رہا تھا۔ اور چند دن بعد کئی قیدیوں سے باتیں کرنے کے بعد وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ جبر اور ظلم کی اس بستی میں وہ اکیلا نہیں۔ یہاں ایسے لوگ موجود ہیں، جو اس سے زیادہ مظلوم ہیں۔



چند ماہ اور گزر گئے۔ پھر ایک دن عاصم کو یہ معلوم ہوا کہ رومی لشکر نینوا کے میدان میں ایرانیوں کو شکست دینے کے بعد دست گرد کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے بعد کسریٰ نے دست گرد سے راہ فرار اختیار کی۔ تو عاصم یہ محسوس کرنے لگا کہ اس کی مصیبت کا دور ختم ہونے والا ہے۔ قید خانہ کا داروغہ بھی اُسے یہ اطمینان دلا چکا تھا کہ جب رومی شہر کے قریب پہنچ جائیں گے تو میرے لیے قید خانے کے دروازے کھول دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔

لیکن کسریٰ کو مدائن میں اطمینان کا سانس لیتے ہی اپنی فوج اور کنیزانِ حرم کے علاوہ ان قیدیوں کی فکر ہوئی جو دشمن کے ساتھ مل کر اس کے لیے بدترین خطرات پیدا کر سکتے تھے ——— چنانچہ ہرقل کی آمد سے تین دن قبل ان لوگوں کو پانچ سو سپاہیوں کی ننگی تلواروں کی حفاظت میں قید خانے سے نکال کر مدائن سے چند میل دور ایک پرانے قلعے کے اندر منتقل کر دیا گیا۔ اس قلعے کے محافظ کا نام مہران تھا اور وہ ان سنگدل لوگوں میں سے تھا جو اپنے حکمران کے انتہائی ظالمانہ احکام کی تعمیل میں بھی ایک لذت محسوس کیا کرتے تھے۔ اور کسریٰ اُسے یہ حکم دے چکا تھا کہ اگر مدائن کو کوئی خطرہ پیش آیا تو ان قیدیوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے تمہیں ہماری طرف سے کسی نئی ہدایت کا انتظار نہیں کرنا چاہیے ———

دست گرد کے قید خانے کے داروغہ کو جس سے عاصم کو کسی بھلائی کی امید ہو سکتی تھی، ان سپاہیوں کی نگرانی سونپ دی گئی تھی جو شاہی خزانہ نکال کر مدائن لے جا رہے تھے۔ عاصم نے اپنے مستقبل کے افق پر امید کی جو روشنی دیکھی تھی اُسے پھر ایک بار مایوسی کی گھٹائیں اپنے آغوش میں لے چکی تھیں۔

اس قلعے میں اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ پہریداروں کو قیدیوں سے ہمکلام ہونے کی اجازت نہ تھی ——— وہ کئی دن انتہائی کرب و اضطراب کی حالت میں رومیوں کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن وہ نہ آئے۔ وہ اکثر یہ سوچا کرتا تھا۔ "کیا یہ ہو سکتا ہے کہ قیصر دست گرد سے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کر کے واپس چلا گیا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اسے کسی جنگ میں شکست ہو گئی ہو۔ اور کیا یہ ممکن نہیں کہ مدائن میں اپنے جھنڈے گاڑنے کے بعد اس کے تھکے ہوئے سپاہیوں نے اس غیر اہم قلعے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی ہو؟"

قلعے کے محافظ نے قیدیوں کو گری ہوئی دیواریں مرمت کرنے اور خندقیں گہری کرنے کے کام پر لگا دیا تھا۔ اور پہریدار ہاتھوں میں کوڑے لیے ہر وقت ان پر مسلط رہتے تھے۔ اگر کوئی بھوک، پیاس یا تھکاوٹ سے نڈھال ہو کر گر پڑتا تو اس پر بے تحاشا کوڑے برسائے جاتے تھے۔ غذا کی کمی اور کام کی زیادتی، اور پہریداروں کے وحشیانہ سلوک کے باعث کئی قیدی طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو چکے تھے۔ اور ہر ہفتے مرنے والوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔

ایک رات چند قیدیوں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن پہریداروں کو بروقت پتہ چل گیا۔ چنانچہ انہوں نے بھاگنے والوں کا پیچھا کیا۔ دو قیدی جنہوں نے مزاحمت کی کوشش کی مسلح سواروں کے ہاتھوں مارے گئے، چار گرفتار کر لیے گئے اور صرف دو ایسے تھے جو دریائے دجلہ عبور کرنے کے بعد کہیں روپوش ہو گئے تھے۔

گرفتار ہونے والے چار آدمیوں کو قلعے کے دروازے کے عین سامنے پھانسی دے دی گئی۔ اور کئی دن تک ان کی لاشیں وہیں لٹکتی رہیں۔ پھر ایک دن جب یہ لاشیں ہڈیوں کے ڈھانچوں میں تبدیل ہو چکی تھیں، سرپٹ سواروں کا ایک دستہ قلعے کے دروازے کے سامنے رکا۔ ایک عمر رسیدہ آدمی نے جو اپنے لباس سے کوئی بڑا افسر معلوم ہوتا تھا فصیل پر سے نیچے جھانکنے والے پہریداروں کی طرف دیکھا۔ اور بلند آواز میں کہا۔ "دروازہ کھولو ہمیں شہنشاہ نے بھیجا ہے"۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور قلعے کا محافظ چند سپاہیوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔

"مجھے پہچانتے ہو؟" عمر رسیدہ آدمی نے کسی توقف کے بغیر پوچھا۔

ردِ چند ثانیے قلعے کے محافظ کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ بالآخر اس نے کہا "تم ساسان ہو۔ تم اس قلعے سے فرار ہو گئے تھے"۔

ساسان نے کہا۔ "اگر چند دنوں میں تمہارا حافظہ بہت زیادہ کمزور نہیں ہو گیا۔ تو میرے دو اور ساتھی اس جگہ موجود ہیں"۔

قلعے کے محافظ نے باقی سواروں کی طرف دیکھا۔ اور اس کی نگاہیں دو آدمیوں پر مرکوز ہو کر رہ گئیں پھر وہ اپنے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر چلایا۔ "انہیں گرفتار کر لو"۔

ساسان نے کہا۔ "نہیں تمہارے آدمی شہنشاہ کے سپاہیوں پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اب میں اس قلعے کا محافظ ہوں اور میں تمہاری گرفتاری کا حکم دیتا ہوں"۔

قلعے کا محافظ غصے اور اضطراب کی حالت میں کبھی اپنے آدمیوں اور کبھی ان سواروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

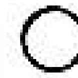
ساسان نے مڑ کر ایک فوجی افسر کی طرف دیکھا۔ اور اس نے اپنا گھوڑا آگے بڑھا کر قلعے کے محافظ کو ایک مراسلہ پیش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ درست کہتے ہیں۔ تم ایران کے نئے شہنشاہ کا حکم نامہ دیکھ سکتے ہو۔"

مہران نے مراسلے کو کھولا، پڑھا اور اس کے چہرے پر موت کی زردی چھا گئی۔

ساسان نے قلعے کے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ایران سے پرویز کی حکومت ختم ہو چکی ہے۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم اپنے نئے حکمران کی اطاعت کرو۔ مدائن یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ اگر تم میں سے کسی کو میری باتوں پر شبہ ہے تو میں اسے وہاں بھیجنے کے لیے تیار ہوں۔"

مہران نے کہا۔ "میں کسی اور کو بھیجنے کی بجائے خود مدائن جانا چاہتا ہوں۔"

"نہیں ہم تمہیں کسی اور جگہ بھیجنا چاہتے ہیں۔" ساسان نے یہ کہہ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ چار آدمی گھوڑوں سے اترے اور انہوں نے مہران کے ہاتھ باندھ دیئے۔ تھوڑی دیر بعد قلعے کے دروازے کے سامنے ہڈیوں کے چار بوسیدہ ڈھانچوں کے ساتھ ایک تازہ لاش لٹک رہی تھی۔



اگلے دن وہ پہریدار جو قیدیوں کو بدترین اذیتیں پہنچانے میں ایک راحت محسوس کیا کرتے تھے، فصیل مرمت کرنے اور خندق کھودنے کے کام پر لگے ہوئے تھے اور چند قیدی جن کے ہاتھ میں بیلچوں اور ٹوکریوں کی بجائے کوڑے دے دیے گئے تھے، ان کی نگرانی پر مامور تھے۔

اب ایران کے انقلاب کی خبر کسی سے پوشیدہ نہ تھی۔ چار دن بعد مدائن سے ایک ایلچی آیا اور اس نے یہ خبر دی کہ کسریٰ پرویز کو مدائن کے قید خانے میں قتل کر دیا گیا ہے۔ ساسان جس نے اپنی زندگی کے دس سال پرویز کی قید میں گزارے تھے، شمالی ایران کے ایک بااثر قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اور وہ شیرویہ سے ان قیدیوں کی رہائی کے مکمل اختیارات لے کر آیا تھا۔ جن کے قبیلوں اور خاندانوں کی دوستی اس کے لیے سود مند ثابت ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ایک ہفتہ کے اندر اندر قریباً ڈیڑھ سو قیدی جنہوں نے ایران کے نئے حکمران کی اطاعت کا حلف اٹھایا تھا۔ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ اور ان کی جگہ لینے کے لیے مدائن سے آئے دن نئے

قیدیوں کی ٹولیاں پہنچ رہی تھیں۔ پرانے قیدیوں میں صرف وہ لوگ رہ گئے تھے جو دور دراز کے صوبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور جنہیں رہا کرنے سے قبل ان کے سرکش عزیزوں اور رشتہ داروں سے اطاعت اور فرمانبرداری کی ضمانت لینے کی ضرورت محسوس کی گئی تھی۔

عاصم کا معاملہ عام قیدیوں سے مختلف تھا۔ دستگرد سے اس قلعے میں منتقل ہونے والے قیدیوں کے جرائم اور سزاؤں کے متعلق یادداشت کی کتاب میں اس کے نام کے ساتھ "رومی جاسوس" کے الفاظ لکھے ہوئے تھے اور اس کی رہائی کا حکم دینا ساسان کے دائرۂ اختیار سے باہر تھا۔

کئی دن انتظار کے بعد عاصم کو ساسان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اور ساسان نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تم میرے لیے اجنبی نہیں ہو۔ میں تمہارے حالات سے پوری واقفیت حاصل کر چکا ہوں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ شیرویہ کی اجازت کے بغیر میں تمہیں رہا نہیں کر سکتا۔ قیدیوں کی کتاب میں تمہارے متعلق یہ لکھا ہوا ہے کہ تم رومیوں کے جاسوس ہو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ الزام غلط ہے لیکن جب تک مدائن پر رومیوں کے حملے کا خطرہ موجود ہے کسی کو تمہاری حمایت میں آواز بلند کرنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ میں تمہیں یہ خوشخبری دے سکتا ہوں کہ ایران کا نیا حکمران ہر قیمت پر رومیوں کے ساتھ صلح کرنا چاہتا ہے اور مدائن کے اکابر کا ایک وفد تبریز کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔ قیصر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے یروشلم کی صلیب بھی رومیوں کو واپس دی جا رہی ہے۔ اگر ہمارے وفد کو کامیابی ہوئی تو ایران کی نئی حکومت اس شخص کے دوست اور ساتھی کو فراموش نہیں کرے گی جس نے اپنی جان پر کھیل کر ایران کو جنگ کی تباہ کاریوں سے بچانے کی کوشش کی تھی —— پھر اگر تمہارے رومی دوست تمہیں بھول نہیں گئے تو مجھے یقین ہے کہ وہ مصالحت کی گفتگو شروع کرنے سے پہلے تمہاری رہائی کا مطالبہ کریں گے۔"

عاصم نے مغموم لہجے میں کہا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ روم اور ایران کی مصالحت کے بغیر میری رہائی کی کوئی صورت نہیں۔"

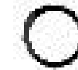
"نہیں میرا یہ مطلب نہیں۔ لیکن تمہیں یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ شیرویہ نے انتہائی ناسازگار حالات میں ایک حکمران کی ذمہ داریاں قبول کی ہیں۔ میں تمہارے ساتھ وعدہ کرتا ہوں کہ جب اُسے اپنے

گرد و پیش سے اطمینان نصیب ہوگا۔ تو میں بذاتِ خود اس کی خدمت میں حاضر ہو کر تمہارا مسئلہ پیش کروں گا۔"

عاصم نے کہا۔ "میری سب سے بڑی امید تھی کہ نورج مجھے فراموش نہیں کرے گا۔ اُسے یہ معلوم تھا کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ کیا آپ اسے یہ پیغام نہیں پہنچا سکتے کہ میں ابھی تک زندہ ہوں۔ جب میں سین کے ساتھ دست گرد پہنچا تھا تو وہ وہاں کی افواج کا سپہ سالار تھا۔"

ساسان نے کہا۔ "نورج مر چکا ہے جب رومی نینوا کی طرف بڑھ رہے تھے تو وہ کمک لے کر گیا تھا اور جنگ میں ہلاک ہو گیا تھا۔"

ساسان کے ساتھ اس ملاقات کے بعد عاصم کی حالت اس مسافر کی سی تھی جو ایک لق و دق صحرا کے بے نشان راستوں پر سفر کر رہا ہو ——— سین جس نے اسے افق کی دھندلی لکیروں کے پیچھے دوڑنا سکھایا تھا اس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ قسطنطیہ نے اسے زندگی کی تڑپ اور ولولے عطا کیے تھے۔ لیکن اب اُسے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ زندہ ہے۔ وہ اکثر اپنے دل سے یہ سوال کیا کرتا تھا کہ اس قلعے سے باہر وہ کون سی جگہ ہے جہاں مجھے امن اور راحت نصیب ہو سکتی ہے۔ اگر قسطنطیہ اس دنیا میں نہیں تو میں آزاد ہو کر کہاں جا سکتا ہوں۔"



اڑھائی مہینے اور گزر گئے۔ پھر ایک شام ساسان کے پاس کوئی ایلچی آیا اور وہ رات کے پچھلے پہر مدائن کی طرف روانہ ہو گیا۔ دس دن بعد ایک صبح عاصم اپنے کمرے سے باہر چہل قدمی کر رہا تھا کہ ایک سپاہی نے اس کے قریب آکر اطلاع دی۔ "ساسان نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔"

"وہ مدائن سے واپس آگئے ہیں؟"

"جی ہاں"

"کب؟"

"وہ آدھی رات کے قریب یہاں پہنچ گئے تھے۔"

تھوڑی دیر بعد عاصم ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا۔ ساسان کے ساتھ ایک اور ضعیف العمر آدمی

جس کی بھویں تک سفید ہو چکی تھیں، بیٹھا ہوا تھا۔

"تم انہیں جانتے ہو؟" ساسان نے عاصم کو دیکھتے ہی سوال کیا۔

عاصم نے غور سے عمر رسیدہ آدمی کی طرف دیکھا اور مذبذب سا ہو کر بولا۔ "آپ کو ایک قیدی کی یادداشت کا امتحان نہیں لینا چاہیے ——— اب میرے دل میں صرف اپنے آلام و مصائب کی یاد باقی رہ گئی ہے۔"

عمر رسیدہ آدمی نے کہا۔ "میرا نام مہرداد ہے۔ اور تم ایک قیدی نہیں ہو۔"

عاصم چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ اور تشکر کے جذبات اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں آنسو بن کر چھلکنے لگے۔

مہرداد نے کہا۔ "تم آزاد ہو اور قید خانے کے دروازے پر ایک گھوڑا تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

عاصم نے ساسان کی طرف دیکھا اور لرزتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ "کیا میں سچ مچ آزاد ہوں؟"

"ہاں تم آزاد ہو ——— مدائن کے اکابر کا جو وفد قیصر کے پاس گیا تھا۔ وہ صلح کی شرائط طے کرنے کے بعد واپس آگیا ہے۔ اور میں اس کی واپسی کی اطلاع ملتے ہی مدائن پہنچ گیا تھا۔ میرا اولین مقصد شہنشاہ کے سامنے تمہاری رہائی کا مسئلہ پیش کرنا تھا۔ لیکن مجھے ان کی خدمت میں پیش ہونے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔ شہنشاہ سے تمہاری رہائی کا فرمان ایک ایسے بزرگ نے حاصل کیا ہے۔ جو اس وفد کے ساتھ گیا تھا۔"

ساسان نے یہ کہہ کر میز سے ایک کاغذ اٹھایا اور عاصم کے ہاتھ میں دے دیا۔

عاصم نے تشکر آمیز نگاہوں سے ساسان کی طرف دیکھا اور پھر مہرداد کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ وہ بزرگ کون ہے۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔"

مہرداد نے جواب دیا۔ "میں اگر کوشش نہ کرتا تو بھی چند دنوں یا چند ہفتوں تک تمہاری رہائی یقینی تھی مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ اس سے قبل تمہارے حال پر توجہ دینے کا موقع نہ ملا۔"

عاصم نے پوچھا۔ "آپ ان رومیوں سے ملے تھے جو سین کے ساتھ دست گرد آئے تھے؟"

"نہیں ، ان میں سے کسی کے ساتھ میری واقفیت نہیں تھی۔"

"آپ سے کسی رومی نے بھی میرے متعلق نہیں پوچھا؟"

"نہیں، وہاں کسی نے تمہارا ذکر نہیں چھیڑا۔ جب ہم قیصر کے پڑاؤ میں داخل ہوئے تھے تو وہاں فتح کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔"

عاصم کے چہرے پر مایوسی چھا گئی ——— ساسان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں اس بات پر پریشان نہیں ہونا چاہیے کہ تمہارے رومی دوستوں نے تمہیں فراموش کر دیا ہے۔ اتنی عظیم فتوحات کے بعد لوگ اپنے ماضی کے دوستوں اور ساتھیوں کو بھول جاتے ہیں۔"

عاصم نے کہا "مجھے یقین ہے کہ اگر میرے دوستوں میں سے کوئی قیصر کے ساتھ ہوتا تو وہ آپ سے میرے متعلق ضرور پوچھتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ سین اپنی بیوی اور بچے خلقدون چھوڑ آیا تھا؟"

مہرداد نے جواب دیا۔ "ہاں مجھے معلوم ہے۔"

"اب وہ کہاں ہیں؟"

"ان کے متعلق میں نے صرف یہ سنا ہے کہ سین کے قتل کے بعد پرویز نے اس کی بیوی اور لڑکی کے متعلق یہ حکم بھیجا تھا کہ انہیں دست گرد پہنچا دیا جائے۔ لیکن پرویز کا حکم پہنچنے سے دو دن قبل وہ کہیں روپوش ہو چکی تھیں۔ قلعے کے محافظ صرف اتنا جانتے تھے کہ وہ شام کے وقت سیر کے لیے نکلی تھیں اور پھر واپس نہیں آئی تھیں۔ ان کا ایک نوکر بھی ان کے ساتھ ہی لاپتا ہو چکا تھا۔"

عاصم نے پرامید ہو کر پوچھا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ قیصر کے ایلچی جو دست گرد آئے تھے وہ بخیریت قسطنطنیہ پہنچ گئے تھے۔"

"ہاں، انہیں ہمارے سپاہیوں نے بحفاظت باسفورس کے پار پہنچا دیا تھا۔ لیکن پرویز نے جن ایرانیوں کو خراج وصول کرنے کے لیے ان کے ساتھ بھیجا تھا۔ ان کے متعلق ہمیں کئی مہینوں کے بعد یہ معلوم ہوا کہ وہ قتل کر دیئے گئے ہیں۔"

عاصم نے پوچھا۔ "کیا قیصر کے ایلچیوں نے واپسی پر خلقدون قیام کیا تھا؟"

"ہاں انہوں نے ایک رات وہاں قیام کیا تھا۔ اور ایک رومی نے قلعے میں سین کی بیٹی کے ساتھ

ملاقات کی تھی ——— لیکن اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ انہیں غائب کرنے میں ان رومیوں کا ہاتھ ہے تو یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ وہ خلقدون سے ان کی روانگی کے دو دن بعد روپوش ہوئی تھیں۔ پرویز کے پاس جب یہ خبر پہنچی تھی تو اس نے قلعے کے بیس پہرے داروں کو قتل کروا دیا تھا۔ پرویز نے ان سپاہیوں کو بھی عبرت ناک سزائیں دی تھیں جو چند دن کی تاخیر سے خلقدون پہنچے تھے۔ مجھے صرف اس بات سے قیصر کے ایلچیوں پر کچھ شبہ ہوتا ہے کہ واپسی پر ان کی رفتار بہت تیز تھی۔ تحقیقات کے دوران میں راستے کی چوکیوں سے اس قسم کی شہادتیں ملی تھیں کہ ہمارے آدمی جو ان کے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔ اس بات کے شاکی تھے کہ رومیوں نے کسی منزل پر بھی انہیں جی بھر کر آرام کرنے نہیں دیا۔"

عاصم نے کہا۔ "بہرحال آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ پرویز نے جو سپاہی سین کی بیوی اور بیٹی کی گرفتاری کے لیے روانہ کیے تھے، وہ رومیوں کے بعد خلقدون پہنچے تھے؟"

"ہاں ان کے دیر سے پہنچنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ کسریٰ کو رومیوں کی روانگی سے چند دن بعد دست گرد کے بڑے کاہن کے اصرار پر ان کی گرفتاری کا خیال آیا تھا۔ اور دوسری وجہ یہ کہ انہوں نے کسی تاخیر کے بغیر خلقدون پہنچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ بہرحال یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ سین کی بیوی اور بیٹی رومیوں کے ساتھ نہیں گئیں۔ جب ان کی تلاش جاری تھی تو میں اکثر مدائن سے دست گرد جایا کرتا تھا تو رج اور چند دوسرے دوستوں کی طرح مجھے بھی یہ شبہ تھا کہ کسریٰ نے انہیں قتل کروا دیا ہے۔ اور اب ان کی تلاش سے اس کا مقصد اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن اب خلقدون کے لشکر کی ایک بڑی تعداد واپس آ چکی ہے اور میں کئی سپاہیوں اور افسروں سے مل چکا ہوں ——— اور وہ سب اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ سین کی بیوی اور بیٹی کہیں روپوش ہو چکی ہیں۔ اور اگر رات کی تاریکی میں قلعے سے باہر ان کے اغوا یا قتل کی کوئی سازش ہوئی ہو تو اس کے ساتھ فوج کا کوئی تعلق نہیں۔"

عاصم کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی، اس نے ساسان کی طرف دیکھا اور کرب انگیز لہجے میں کہا "میں جا سکتا ہوں۔"

ساسان نے اٹھ کر کہا۔ "نہیں تم پہلے اپنے کمرے میں جا کر ناشتا کر لو۔ اور تمہارا لباس بھی ٹھیک

نہیں، میں تمہارے لیے نئے کپڑے بھیجتا ہوں۔ کچھ اور ضروری سامان تمہارے گھوڑے کی خرجین میں رکھوا دیا جائے گا۔"

مہرداد نے کہا۔ "ہم قلعے کے دروازے پر تمہارا انتظار کریں گے۔ لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"مجھے معلوم نہیں۔" عاصم نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی آنسو جنہیں وہ بڑی مشکل سے ضبط کیے ہوئے تھا اس کی آنکھوں سے اُبل پڑے۔

مہرداد نے اٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "شاید تمہیں یہ معلوم نہیں کہ سین میرا بہترین دوست تھا۔ اور اگر میرا بیٹا ایرج زندہ ہوتا تو فسطینہ میری بہو ہوتی۔"

"نہیں۔" عاصم نے جواب دیا۔ "میں اپنے محسن کو خوش کرنے کے لیے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اگر ایرج اپنی موت سے پہلے آپ سے ہمکلام ہو سکتا تو وہ آپ سے یہ کہتا کہ فسطینہ نے آپ کے بیٹے کی مسرتوں میں شریک ہونے کی بجائے ایک ایسے انسان کی بدنصیبی میں حصہ دار بننا قبول کر لیا تھا جو اُسے محبت کے دکھوں کے سوا کچھ نہیں دے سکتا۔ نادان لڑکی مرمریں ایوانوں سے منہ پھیر کر اس غریب الدیار کی رفاقت قبول کرنے پر آمادہ ہے جو اُسے ایک جھونپڑا بھی عطا نہیں کر سکتا۔"

مہرداد دیر تک سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "اگر تم فسطینہ کو تلاش کر سکو تو تمہیں جھونپڑا تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میرے گھر کا دروازہ تمہارے لیے ہر وقت کھلا ہے گا۔ میں یہی سمجھوں گا کہ ایرج ایک نئے وجود میں میرے پاس واپس آگیا ہے۔"

عاصم نے تشکر آمیز لہجے میں جواب دیا۔ "ممکن ہے کہ میں کسی دن آپ کے پاس پناہ لینے پر مجبور ہو جاؤں لیکن اس وقت میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔"

"تم قسطنطنیہ جاؤ گے؟"

"ہاں"

"اور اس کے بعد؟"

"اس کے بعد میں ساری زندگی فسطینہ کی تلاش میں گزار دوں گا۔"

ساسان نے کہا۔ "اگر فسطینہ کے متعلق تمہارے جذبات یہ ہیں تو اسے نادان ہونے کا طعنہ کون دے سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُسے تمہارا جھونپڑا مدائن کے سارے محلات سے زیادہ کشادہ اور خوبصورت نظر آئے گا۔"

عاصم کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ نیا لباس پہن کر قلعے کے دروازے پر پہنچا تو ایک سپاہی ایک خوبصورت گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ اور ساسان اور ایرج کے باپ کے علاوہ قلعے کے چند محافظ اس کا انتظار کر رہے تھے۔

اس نے باری باری ان کے ساتھ مصافحہ کیا۔ اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

ساسان نے چند قدم اس کا ساتھ دیا اور دروازے سے باہر نکل کر دوبارہ اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "جب تم خرجین میں ہاتھ ڈالو گے تو تمہیں ایک چمڑے کی تھیلی ملے گی۔ یہ مہرداد کا تحفہ ہے اس کی یہ خواہش کہ تمہیں سفر کے دوران کوئی تکلیف نہ ہو۔"

باب ۴۰

عاصم نے کئی دن دریائے فرات کے کنارے کے ساتھ ساتھ اپنا سفر جاری رکھا۔ مہرداد نے رخصت کے وقت جو تھیلی اس کے گھوڑے کی خرجین میں رکھوادی تھی وہ اشرفیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اور ان اشرفیوں کی بدولت اسے راستے کی منازل میں شہر نے یا تازہ دم گھوڑے تبدیل کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ ایران کی قدیم سرحد عبور کرنے کے بعد اس نے سیدھا ایشیائے کوچک کا رخ کرنے کی بجائے شام کے اس راستے سفر کرنا زیادہ مناسب خیال کیا جو نسبتاً آباد علاقوں سے گزرتا تھا ——

ایک دن دوپہر کے وقت وہ حلب سے چند کوس دور دریا کے کنارے ایک بستی میں داخل ہوا اور سرائے سے کھانا کھانے اور گھوڑا تبدیل کرنے کے بعد دریا عبور کرنے کی نیت سے گھاٹ کی طرف چل پڑا۔ لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بستی کی تمام کشتیاں دوسرے کنارے جمع ہونے والے مسافروں کو لانے کے لیے روانہ ہو چکی ہیں۔ عاصم جو شام سے پہلے اگلی منزل تک پہنچنے کے لیے بے قرار تھا انتہائی اضطراب کی حالت میں کشتیوں کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

ایک ساعت بعد پانچ کشتیاں مسافروں اور ان کے گھوڑوں سمیت واپس آ رہی تھیں۔ بیشتر مسافر اپنے لباس سے ایرانی فوج کے افسر اور سپاہی معلوم ہوتے تھے۔ لیکن سب سے اگلی کشتی پر آٹھ آدمی رومیوں کا لباس پہنے ہوئے تھے

بستی کے چند آدمی جو دریا کے کنارے جمع ہو گئے تھے انتہائی غم و غصہ کی حالت میں ایرانیوں کی طرف دیکھ رہے تھے اور ایک عمر رسیدہ شامی راہب چلا چلا کر یہ کہہ رہا تھا۔ "آج ایرانی رومیوں کے دوست بن گئے

ہیں لیکن ہم ان ظالموں کو اپنی بستیوں سے گزرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔"

ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر کہا۔ "مقدس باپ! اب جنگ ختم ہو چکی ہے اور یہ لوگ اپنے گھروں کو واپس جا رہے ہیں۔"

"نہیں نہیں"۔ راہب چلایا۔ "مجوسیوں کے ساتھ ہماری جنگ ختم نہیں ہو سکتی۔ انطاکیہ، حلب، دمشق اور یروشلم کو تباہ کرنے والوں کو زندہ رہنے کا حق نہیں دیا جا سکتا۔"

نوجوان نے برہم ہو کر کہا۔ "اگر آپ لڑنا چاہتے ہیں تو ہم آپ کو روکنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ لیکن ہم آپ کی خاطر مزید خون نہیں دے سکتے۔ رومیوں سے بھی آپ کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ آپ کی خاطر مزید قربانیاں دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے —— دیکھیے وہ قریب آ رہے ہیں۔ اگر آپ اپنی زبان پر قابو نہیں رکھ سکتے تو یہاں سے تشریف لے جائیے ورنہ ...."

"ورنہ کیا ہوگا؟" راہب نے تلملا کر کہا۔

نوجوان نے جواب دیا۔ "ورنہ میں آپ کو دریا میں پھینک دوں گا۔ اور بستی کا کوئی آدمی آپ کی مدد نہیں کرے گا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ تیرنا نہیں جانتے۔"

راہب نے چلانے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز تماشائیوں کے قہقہوں میں دب کر رہ گئی۔ اور وہ غصے سے کانپتا اور گالیاں دیتا ہوا ایک طرف چل دیا ——

کشتیاں قریب آ چکی تھیں اور عاصم دم بخود ہو کر سب سے اگلی کشتی پر ایک جانی پہچانی صورت دیکھ رہا تھا۔ یہ ویریس تھا۔

عاصم کے دل کی دھڑکن کبھی تیز اور کبھی سست ہو رہی تھی۔ وہ کبھی مسرت کے ساتویں آسمان پر پرواز کر رہا تھا اور کبھی مایوسی کے سمندر میں غوطے لگا رہا تھا۔ ویریس جو ایک ایرانی سے باتیں کر رہا تھا، اچانک ساحل کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اس کی نگاہیں عاصم کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ اور پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیے۔ کشتی کنارے پر لگی۔ عاصم اپنے گھوڑے کی باگ چھوڑ کر آگے بڑھا۔ اور ویریس کشتی سے کود کر اس کے ساتھ لپٹ گیا۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس جگہ تم سے ملاقات ہو گئی۔ ورنہ میں تمہاری تلاش میں مدائن جا رہا تھا۔ اور وہاں سے نامعلوم مجھے ایران کے کتنے شہروں کی خاک چھاننا پڑتی۔"

عاصم نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی آواز حلق سے باہر نہ آ سکی۔ تاہم اس کی نگاہیں ولیریس کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھیں۔

اس نے عاصم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "عاصم! فسطینہ زندہ ہے"۔ اور عاصم کے سامنے ساری کائنات اپنی حسین مسکراہٹوں کے ساتھ رقص کرنے لگی۔

"وہ کہاں ہے؟" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے

"وہ قسطنطنیہ میں ہے اور ہم بہت جلد وہاں پہنچ جائیں گے۔"

اتنی دیر میں چند رومی اور ایرانی ان کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ ولیریس ایک معمر آدمی سے جو اپنے لباس سے ایرانی فوج کا کوئی بڑا عہدہ دار معلوم ہوتا تھا، مخاطب ہو کر بولا۔ "قدرت نے مجھے ایک طویل سفر سے بچا لیا ہے۔ اب ہم یہیں سے واپس چلے جائیں گے۔ عاصم یہی ہے۔"

عمر رسیدہ ایرانی نے آگے بڑھ کر عاصم کے ساتھ مصافحہ کیا اور اس کے ساتھی باری باری اسکی تقلید کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد عاصم، ولیریس اور دوسرے رومی کشتی پر سوار ہو کر دوسرے کنارے کا رخ کر رہے تھے اور ایرانی جوان کے ساتھ آئے تھے اپنے ہاتھ بلند کر کے انہیں الوداع کہہ رہے تھے۔

ولیریس نے عاصم کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "تم نے یہ نہیں پوچھا کہ فسطینہ قسطنطنیہ کیسے پہنچ گئی۔"

عاصم نے اطمینان سے جواب دیا۔ "مجھے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ میرے لیے صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ وہ زندہ ہے۔ قید سے رہا ہوتے وقت یہ معلوم ہو گیا تھا کہ فسطینہ اور اس کی ماں قلعے سے غائب ہو گئی تھیں مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ تم لوگ واپسی پر وہاں ٹھہرے تھے۔ اور تم میں سے کسی نے ان کے ساتھ ملاقات بھی کی تھی۔ لیکن جب تم قلعے سے روانہ ہوئے تھے تو وہ تمہارے ساتھ نہیں تھیں۔ میرا خیال ہے کہ سین کے کسی دوست نے انہیں قسطنطنیہ پہنچا دیا ہوگا۔"

ولیریس نے کہا۔ "خلقدون میں سین کا ایک ہی دوست تھا جس پر ہم اعتماد کر سکتے تھے۔ اور وہ اس کا بوڑھا نوکر فیروز تھا۔ وہ کلاڈیوس کی ہدایت کے مطابق ہماری روانگی سے تیسرے روز شام کے وقت ان کے ساتھ سمندر کے کنارے پہنچ گیا تھا اور رات کے وقت ہم کشتی لے کر وہاں پہنچ گئے تھے ——— قیصر کی پیش قدمی کے ایام میں ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ تمہیں تلاش کرنا تھا۔ کلاڈیوس کو قسطنطنیہ کی حفاظت کی ذمہ داری سونپ دی گئی تھی اور مجھے کئی بار قرطاجنہ سے رسد اور کمک لانے کے لیے جانا پڑا۔"

عاصم نے سوال کیا۔ "اب کلاڈیوس کہاں ہے؟"

"وہ قسطنطنیہ میں ہے ——— وہ میرے ساتھ آنا چاہتا تھا۔ لیکن طرابزون سے ہرقل کی روانگی کی اطلاع ملی اور اُسے مجبوراً رکنا پڑا۔ میرے ساتھیوں کو اس بات کا ملال تھا کہ وہ قسطنطنیہ میں ہرقل کا جلوس نہیں دیکھ سکیں گے۔ لیکن اب میرا خیال ہے کہ شاید ہم وقت پر پہنچ جائیں۔ ہمیں انطاکیہ پہنچتے ہی جہاز مل جائے گا۔ اور اگر ہوا موافق ہوئی تو باقی سفر چند دنوں میں طے ہو جائے گا۔ میں گھوڑے کی سواری سے تنگ آ چکا ہوں۔"

عاصم نے پوچھا۔ "یہ ایرانی خلقدون سے آپ کے ساتھ آئے تھے؟"

"ہاں۔ کلاڈیوس ایران کے نئے حکمران کے ساتھ صلح کے بعد خلقدون پہنچا تھا اور ایرانی لشکر کے سپہ سالار سے یہ وعدہ لے کر آیا تھا کہ تمہیں تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ پھر جب ایران کی بیشتر فوج اناطولیہ کے راستے واپس جا رہی تھی تو کلاڈیوس کا خیال تھا کہ یہ لوگ کسی تاخیر کے بغیر تمہاری خبر دیں گے لیکن جب کوئی اطلاع نہ ملی تو کلاڈیوس نے مجھے مدائن بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس عرصہ میں باسفورس کے پار ایرانیوں کا پڑاؤ قریباً خالی ہو چکا تھا اور سپہ سالار بھی واپس جا چکا تھا۔ یہ ایرانی جو میرے ساتھ آئے تھے ان جنگی قیدیوں میں سے تھے جنہیں جنگ کے ایام میں طرابزون سے قسطنطنیہ بھیجا گیا تھا ——— اب میں تمہیں ایک افسوسناک خبر سناتا ہوں۔"

"فسطینہ کی ماں کے متعلق؟" عاصم نے مضطرب سا ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔ وہ قسطنطنیہ پہنچنے کے تین ماہ بعد فوت ہو گئی تھیں۔ اور چند ماہ بعد ان کا وفادار نوکر بھی وفات

پاگئی تھا۔ قسطینہ کے دل پر ان حادثات کا گہرا اثر ہوا ہے۔ کلاڈیوس کی بیوی اور بہن اسے سارا دن تسلی نہ دیں تو خدا معلوم اس کا کیا حال ہوتا۔ ماں کی موت کے بعد اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ خدا اس سے ناراض ہے۔ وہ بار بار کہتی ہے کہ اگر میں یروشلم میں راہبہ بننے سے انکار نہ کرتی تو میرے والدین کا یہ انجام نہ ہوتا۔ اس نے کئی بار راہبہ کی زندگی اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن جب کلاڈیوس اور اس کی بیوی اسے یہ سمجھاتے کہ عاصم زندہ ہے اور وہ عنقریب تمہاری تلاش میں یہاں پہنچے گا تو اس کی ہمت جواب دے جاتی ہے۔ پچھلے سال ایک روز وہ اچانک کہیں غائب ہو گئی تھی۔ دو دن اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ تیسرے دن علی الصباح وہ خود ہی کلاڈیوس کے گھر پہنچ گئی اور یہ معلوم ہوا کہ وہ راہبہ بننے کے لیے خانقاہ میں چلی گئی تھی۔ لیکن رات کے وقت اس نے خواب دیکھا کہ تم واپس آگئے ہو۔ اور وہ صبح بیدار ہوتے ہی وہاں سے بھاگ آئی ——— اس کے بعد اس خانقاہ کے راہبوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ اکثر کلاڈیوس کے گھر آکر اسے تبلیغ کرتے ہیں اور قسطینہ انہیں ہر بار یہ تسلی دیتی ہے کہ میں نے راہبہ بننے کا ارادہ ترک نہیں کیا۔ میں صرف چند دن کی مہلت چاہتی ہوں ——— کلاڈیوس کو ہمیشہ اس بات کا اندیشہ لگا رہتا ہے کہ وہ پھر کسی دن خانقاہ میں چلی جائے گی اور اس مرتبہ اس کے لیے باہر آنے کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے ———

عاصم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے دل و دماغ میں اور اس کی نگاہوں کے سامنے قسطینہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کے کان صرف قسطینہ کی سسکیاں سن رہے تھے۔

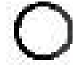
ولیریس نے کہا۔ "میں نے تمہیں ایک بات نہیں بتائی۔ میری شادی ہو چکی ہے۔"

عاصم نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ اور میرے خیال میں تمہاری دلہن کا نام جولیا ہے۔"

"ہاں، لیکن اب بھی یہ ایک خواب محسوس ہوتا ہے۔ شادی سے ایک ہفتہ قبل مجھے یہ امید نہ تھی کہ جولیا کا باپ اچانک مجھ پر اس قدر مہربان ہو جائے گا۔ میں جس قدر جولیا سے محبت کرتا تھا، اسی قدر مجھے اس بات

کا اندیشہ تھا کہ مرقس کا خاندانی غرور ہمارے درمیان ایک آہنی دیوار کی طرح حائل ہے۔ کلاڈیوس کو اپنا بہترین دوست سمجھنے کے باوجود مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس تھا۔ لیکن جب ہم دشت گردی سے واپس آئے تو مرقس پہلی بار مجھ سے بغل گیر ہو کر ملا۔ اور ہماری سرگزشت سننے کے بعد اس نے کسی تمہید کے بغیر یہ اعلان کر دیا کہ اگر قسطنطنیہ پر کوئی نئی مصیبت نہ آگئی تو ایک ہفتہ کے اندر اندر جولیا کی شادی کر دی جائے گی۔ میں نے جھجکتے ہوئے دولہا کے متعلق پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ "وہ ایک بہادر اور قابل اعتماد نوجوان ہے اور اس کا نام ولیریس ہے۔"

ولیریس اپنی شادی کی ساری تفصیلات سنانا چاہتا تھا۔ لیکن عاصم کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے خیالات کسی اور سمت پرواز کر رہے ہیں۔ چنانچہ ولیریس نے اس کی بے توجہی سے پریشان ہو کر گفتگو کا موضوع بدل دیا۔



چند دن گھوڑوں پر سفر کرنے کے بعد عاصم اور ولیریس ایک دوپہر انطاکیہ میں داخل ہوئے تو انہیں یہ اطلاع ملی کہ بندرگاہ پر قسطنطنیہ کا ایک جہاز تیار کھڑا ہے۔ چنانچہ وہ کسی توقف کے بغیر بندرگاہ کی طرف چل دیے۔ لیکن وہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ جہاز بھر چکا ہے۔ چند مسافر جنہیں اس جہاز میں جگہ نہیں مل سکی تھی کپتان کے ساتھ تکرار کر رہے تھے۔ ایک غسانی رئیس انتہائی غصے کی حالت میں چلا رہا تھا۔ "میں قیصر کے لیے اپنے حکمران کی طرف سے مبارکباد کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ اگر مجھے اس جہاز میں جگہ نہ ملی۔ تو میں انطاکیہ کے حاکم سے تمہاری شکایت کروں گا۔ دیکھو میں قیصر کے لیے تحائف لے کر جا رہا ہوں اور فتح کے جشن سے قبل میرا قسطنطنیہ پہنچنا ضروری ہے۔"

کپتان نے بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے تحائف پہنچا دینے کا ذمہ لے سکتا ہوں۔ لیکن تمہارے لیے میرے جہاز پر کوئی جگہ نہیں۔ فتح کا جشن کئی دن جاری رہے گا اور تمہیں دو تین دن کے اندر کوئی جہاز مل جائے گا۔"

"لیکن میں قیصر کا جلوس دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ قیصر بہت جلد قسطنطنیہ پہنچ جائیگا۔"

کپتان نے کہا۔ "یہ تمام مسافر قیصر کا جلوس دیکھنے کے لیے بیتاب ہیں ——— لیکن اس بات کا فیصلہ صرف میں کرسکتا ہوں کہ میرے جہاز پر کتنے آدمی سوار ہوسکتے ہیں۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ انطاکیہ سے جتنے مسافر میرے جہاز پر سوار ہوئے ہیں۔ وہ سب قیصر کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر جارہے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی ایسا نہیں جسے قیصر کے جلوس سے دلچسپی نہ ہو۔"

ولیریس اپنے مضبوط بازوؤں سے راستہ صاف کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اور بولا۔ "تمہارے جہاز پر ایک تجربہ کار ملاح کو جگہ نہیں مل سکتی؟"

"ولیریس" کپتان نے چونک کر کہا۔ "آپ اتنی جلدی واپس آگئے۔ میں نے تو یہ سنا تھا کہ آپ مدائن جارہے ہیں۔"

ولیریس نے جواب دیا۔ "مجھے وہاں جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اور اب میں کسی تاخیر کے بغیر قسطنطنیہ پہنچنا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھی گھوڑوں پر اپنا سفر جاری رکھیں گے۔ آپ کو صرف ایک اور مسافر کو جگہ دینی پڑے گی"

کپتان نے جواب دیا۔ "آپ کو جہاز پر سوار ہونے کے لیے میری اجازت کی ضرورت نہیں۔"

غسانی رئیس نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ "لیکن آپ تو یہ کہتے تھے کہ آپ کا جہاز پُر ہوچکا ہے۔"

"میں درست کہتا ہوں۔ شاید تمہیں یہ معلوم نہیں کہ ولیریس مجھے سارا جہاز خالی کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ولیریس اور عاصم جہاز پر سوار ہوچکے تھے۔ ہوا موافق تھی۔ اور چند دن بعد یہ جہاز ایک صبح بحیرۂ مارمورا سے نکل کر آبنائے باسفورس میں داخل ہوچکا تھا۔ بائیں ہاتھ قسطنطنیہ کی فصیل پر عورتوں اور مردوں کا ہجوم دکھائی دے رہا تھا۔ کئی جہاز بندرگاہ سے باسفورس کے دونوں کناروں پر رکے ہوئے تھے ——— سامنے، بحیرہ اسود کی سمت سے بیس جنگی جہاز بندرگاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور سب سے اگلے جہاز پر قیصر کا پرچم لہرا رہا تھا۔

ولیریس، عاصم اور چند اور مسافر جہاز کے اگلے سرے پر کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ جہاز کے

کپتان نے ولیریس سے مخاطب ہوکر کہا۔ "جناب قیصر تشریف لا رہے ہیں اور اب کچھ دیر ہمیں بندرگاہ سے دور رکنا پڑے گا۔ آپ کا کیا حکم ہے؟"

ولیریس نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے ہم قیصر کے بیڑے کی آمد سے پہلے بندرگاہ پر پہنچ سکتے ہیں۔"

"جناب میں آپ کی حکم عدولی نہیں کرسکتا لیکن مجھے ڈر ہے کہ جو لوگ بندرگاہ پر قیصر کے استقبال کے لیے کھڑے ہیں وہ میری اس جسارت کو پسند نہیں کریں گے۔"

ولیریس نے کہا۔ "بہت اچھا تم کچھ دور آگے جاکر جہاز کا لنگر ڈال دو اور ہمارے لیے کشتی اتار دو۔ ہم بندرگاہ کے ایک طرف اتر جائیں گے۔"

باقی مسافر ایک ساتھ شور مچانے لگے۔ "جناب ہم بھی قیصر کا جلوس دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم اتنی دور سے آئے ہیں۔ ہم برسوں سے اس مبارک دن کا انتظار کررہے ہیں۔"

ولیریس نے کہا۔ "ہمارا جہاز اس وقت بندرگاہ کے قریب نہیں جاسکتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم سب قیصر کا جلوس دیکھ سکو گے۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔"

تھوڑی دیر بعد جب عاصم اور ولیریس کے علاوہ چند اور مسافر رسی کی سیڑھی سے اتر کر کشتی پر سوار ہو رہے تھے۔ ایک تیز رفتار کشتی ان کے قریب پہنچی اور ایک رومی افسر نے پوری قوت سے چلا کر کہا "ٹھہرو! تم بندرگاہ کی طرف نہیں جاسکتے۔"

ولیریس نے مڑ کر رومی افسر کی طرف دیکھا۔ اور اسے کچھ اور کہنے کی جسارت نہ ہوئی۔ ولیریس نے کہا "قسطنطنیہ کی بندرگاہ اتنی تنگ نہیں کہ یہ چھوٹی سی کشتی قیصر کا راستہ روک سکے۔"

رومی افسر نے معذرت طلب لہجے میں کہا۔ "جناب میں آپ کو پہچان نہیں سکا لیکن آپ جلدی کریں شہنشاہ کا بیڑا بہت قریب آچکا ہے۔"

"تم فکر نہ کرو۔ بیڑا ابھی کافی دور ہے اور تم اس عرصے میں اس جہاز کے مسافروں کو اتارنے کا بندوبست کرسکتے ہو۔ یہ سب قیصر کا جلوس دیکھنے کے لیے بیتاب ہیں۔ مسافروں کو اتارنے کے لیے دو اور کشتیاں کافی ہوں گی۔"

"بہت اچھا جناب۔ آپ کے حکم کی تعمیل میرا فرض ہے۔"

○

ہرقل کا جہاز بندرگاہ پر لگا اور چاروں طرف مسرت کے نعرے بلند ہونے لگے۔ وہ جہاز سے اترا۔ اور ہزاروں انسان فرطِ عقیدت سے دوزانو ہوگئے۔ وہ اپنے راستے میں بچھے ہوئے بیش قیمت قالینوں اور ان پر بکھرے ہوئے پھولوں کو روندتا ہوا آگے بڑھا اور شاہی رتھ پر جس کے آگے آٹھ سفید گھوڑے جتے ہوئے تھے، سوار ہوگیا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا اور لوگ نئے جوش و خروش کے ساتھ نعرے لگانے اور پھول نچھاور کرنے لگے۔ اس کے آگے سینکڑوں آدمی باجے اور نقارے اٹھائے کھڑے تھے اور پیچھے جہازوں سے اترنے والے سپاہی صفیں درست کر رہے تھے۔ وہ اپنا ہاتھ بلند کرکے کبھی دائیں، کبھی بائیں طرف دیکھتا اور کبھی اس کی نگاہیں فصیل پر جمع ہونے والوں کی طرف مرکوز ہو کر رہ جاتیں۔ اس کی ہر جنبش، ہر حرکت اور ہر ادا زبانِ حال سے اس امر کا اعلان کر رہی تھی کہ آج خدا کی دنیا میں میرے سوا کوئی نہیں۔

عاصم جیسے ولیریس کی رفاقت کی بدولت بندرگاہ پر جمع ہونے والے ہجوم سے نکلنے کے بعد فصیل کے ایک برج کے نیچے کھڑا ہونے کے لیے جگہ مل گئی تھی۔ غرور اور سطوت کے اس پیکرِ مجسم کی طرف دیکھ کر بار بار یہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ وہی ہرقل ہے" ———

ولیریس نے کہا۔ "میرے دوست آج تم پہلی مرتبہ اسے ایک فاتح کی حیثیت میں دیکھ رہے ہو ——— آج تم قسطنطنیہ کے کسی باشندے کو نہیں پہچان سکو گے۔ آج دنیا کی ساری توانائی اور سارا غرور سمٹ کر رومیوں کے وجود میں آگیا ہے۔ آج جب شاہی محل کی بالکنی سے تم ہرقل کی تقریر سنو گے تو یہ محسوس کرو گے کہ تم نے پہلے کبھی اس کی آواز نہیں سنی۔"

عاصم اپنے دائیں بائیں ان لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو شراب کے مشکیزے اٹھائے ہوئے تھے۔ اور اپنے حکمران کی طرف دیکھنے اور انتہائی جوش و خروش کے عالم میں چند نعرے لگانے کے بعد ہر بار چند گھونٹ حلق سے اتارنے کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔

وہاں ایسی عورتوں کی بھی کمی نہ تھی جو شراب کے نشے میں مدہوش مردوں سے بوس و کنار میں مشغول تھیں ایک قوی ہیکل رومی نے ایک دوشیزہ کو کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ اور وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔

ایک رومی شراب سے مدہوش ہوکر اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا "میں فصیل سے چھلانگ لگا کر خندق کے دوسرے کنارے پر پہنچ سکتا ہوں اور اس کے ساتھی چلا رہے تھے۔ "تم جھوٹ کہتے ہو۔ تم بالکل جھوٹ کہتے ہو۔"

شرابی نے ایک لڑکی کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا۔ "تم بتاؤ میں جھوٹ کہتا ہوں؟"

"ہاں" اس نے نشے میں جھومتے ہوئے جواب دیا۔

"خدا کی قسم میں سچ کہتا ہوں۔ میں بالکل سچ کہتا ہوں" ——— شرابی نے لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر چند جھٹکے دیے اور پھر کسی توقف کے بغیر فصیل سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ اس کے بعد چند تماشائی آگے جھک کر خندق میں پڑی ہوئی لاش کی طرف دیکھ رہے تھے اور باقی قہقہے لگا رہے تھے۔

ولیریس نے اپنے ایک یونانی دوست کے ہاتھ سے شراب کے دو جام پینے کے بعد تیسرا جام عاصم کو پیش کیا لیکن اس نے انکار کر دیا۔

ولیریس نے اصرار کرتے ہوئے کہا "میرے دوست یہ شراب بہت اچھی ہے اور ایسا دن بار بار نہیں آئے گا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے لیے یہاں ٹھہرنا بہت تکلیف دہ ہے۔ لیکن اس وقت انہیں تلاش کرنا ممکن نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ فسطینہ، انطونیہ اور جولیا کے ساتھ ہوگی۔ اور وہ جلوس کے اختتام سے قبل گھر نہیں پہنچیں گی۔ چند گھونٹ پینے کے بعد تمہاری پریشانی دور ہو جائے گی ———"

عاصم نے جواب دیا۔ "قید کے ایام میں، میں کسی ایسے نشے کی ضرورت محسوس کیا کرتا تھا جو مجھے ہمیشہ کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دے۔ لیکن آج میں مدہوش ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔"

عاصم کی بات ولیریس کے یونانی دوست کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس نے ولیریس کے ہاتھ سے جام لیکر منہ کو لگا لیا اور اسے ختم کرنے کے بعد عاصم کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دنیا میں کوئی شراب کے بغیر زندہ کیسے رہ سکتا ہے۔ جب دشمن قسطنطنیہ کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا تو ہم اپنا غم غلط کرنے کے لیے پیا کرتے تھے اور اب جب ہمیں دشمن پر ایک عظیم فتح نصیب ہوئی ہے۔ تو ہمارے

لیے اپنی مسرتوں کے اظہار کے لیے بھی اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ ویلریس معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ساتھی فتح اور شکست دونوں سے ناآشنا ہے اور اس نے کوئی بڑا غم یا کوئی بڑی خوشی نہیں دیکھی۔"

قیصر کا جلوس روانہ ہو چکا تھا اور لوگ بندرگاہ کی بجائے فصیل کی دوسری جانب دیکھ رہے تھے۔ بعض آدمی جلوس کا ساتھ دینے کی نیت سے نیچے اتر رہے تھے۔ ویلریس نے عاصم سے کہا۔ "میں نے ابھی کلاڈیوس کو دیکھا تھا۔ لیکن اب اُسے اتنی بھیڑ میں تلاش کرنا مشکل ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ ہم جلوس کے ساتھ چلنے کی بجائے دوسرے راستے محل کے سامنے پہنچ جائیں۔ جلوس کے اختتام پر قیصر اپنے محل کی بالکنی سے تقریر کرے گا۔ اور ہم اسے زیادہ قریب سے دیکھ سکیں گے ——— چلو عاصم چند برس بعد تم اس بات پر فخر کیا کرو گے کہ جب ہرقل ایران کی فتوحات سے واپس آیا تھا تو تم نے اپنی آنکھوں سے اس کا جاہ و جلال دیکھا تھا اور اپنے کانوں سے اس کی تقریر سنی تھی۔ اور تمہارے بچوں اور تمہارے پڑوسیوں کو تمہاری باتیں ناقابلِ یقین معلوم ہوں گی۔"

عاصم نے ادھر ادھر دیکھا۔ ویلریس کا یونانی دوست وہاں سے جا چکا تھا اور جو لوگ ابھی تک وہاں موجود تھے وہ پورے انہماک سے فصیل کے ساتھ ساتھ ایک کھلی سڑک پر گزرتے ہوئے جلوس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عاصم قدرے توقف کے بعد ویلریس سے مخاطب ہوا ——— "میرے دوست میں نے اپنی زندگی میں جو کچھ دیکھا ہے وہ آج بھی مجھے ناقابلِ یقین محسوس ہوتا ہے۔ میں نے اس شہنشاہ کا جاہ و جلال دیکھا ہے جس کی نگاہوں کے اشاروں سے مشرق و مغرب کی اقوام کی قسمت کے فیصلے ہوتے تھے۔ میں سطوت اور غرور کے اس پیکرِ مجسم کو دیکھ چکا ہوں جس کے اقتدار کا سفینہ انسانیت کے خون میں تیرتا تھا ——— میں نے اس لشکر کی فتوحات دیکھی ہیں جس کی رفتار کے سامنے زمین کی وسعتیں سمٹ گئی تھیں۔ پرویز کے لشکر نے شام اور مصر کی فتوحات کے بعد جو جشن منائے تھے وہ تمہارے اس جشن سے کم نہ تھے۔ یروشلم کی فتح کے بعد میں نے شراب سے مدہوش ایرانیوں کے جو مہیب قہقہے اور بے بس عورتوں کی جو چیخیں سنی تھیں، وہ اس وقت بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔ میں اس اندوہناک ماضی کو بھول جانا چاہتا ہوں جس کی تاریخ میرے نزدیک ظالم اور مظلوم کی داستانوں کے سوا کچھ نہیں۔"

ویلریس نے کہا۔ "پرویز کا ظلم اس کی زندگی کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ اور اب ہم انسانیت کی تاریخ کا ایک نیا ورق الٹ چکے ہیں۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم روم کی اس عظیم فتح پر خوش نہیں ہو۔"

عاصم نے اپنے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "شاید میں ان لوگوں میں سے ہوں، جو ناممکنات پر یقین رکھتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی کے چند المناک واقعات کے بعد یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ انسانیت کی نجات جنگ کے اختتام میں ہے۔ پھر میں نے اپنے آپ کو یہ فریب دینے کی کوشش کی تھی کہ دنیا پر ایک عظیم شہنشاہ کے غلبہ سے قبیلوں، نسلوں اور ملکوں کی جنگ ختم ہو جائے گی۔ اور میرے نزدیک وہ عظیم شہنشاہ خسرو پرویز تھا۔ لیکن مجھے معلوم ہوا کہ طاقت ایک جابر انسان کو انصاف کی طرف مائل نہیں کرتی، بلکہ اور زیادہ جابر بنا دیتی ہے اور میں پرویز کے لشکر کا ساتھ دے کر صرف اپنے انا کی تسکین کا سامان مہیا کر رہا تھا۔ پھر جب حالات مجھے حبشہ کے راستے سے مؤثر قسطنطنیہ لے آئے اور میں ایران کے ظالم حکمران کا ساتھ چھوڑ کر روم کے مظلوم حکمران کا طرف دار بن گیا تو میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ روم اور ایران کی جنگ مزید خونریزی کے بغیر ختم ہو جائے اور کم از کم آبنائے باسفورس کے اس پار بسنے والے تباہی کے اس سیلاب سے بچ جائیں، جس کی ہولناکیاں مشرقی ممالک کے باشندے دیکھ چکے ہیں۔ لیکن صلح کے لیے سین کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے بعد قیصر کی فتح میرے نزدیک ایک معجزہ تھی۔ اور میں نے قید سے رہا ہونے کے بعد یہ محسوس کیا تھا، قیصر کی یہ غیر متوقع کامیابی امن اور عدل و انصاف کے متعلق سین کے سپنوں کی تعبیر ہے۔ لیکن آپ برا نہ مانیے۔ ابھی تھوڑی دیر قبل جب میں قیصر کو رتھ پر سوار ہوتے دیکھ رہا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسریٰ پرویز دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔ اس کی صورت اُس حکمران سے مختلف نہ تھی جسے میں نے یروشلم کی فتح کے بعد دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر نعرے لگانے والے بھی مجھے ان لوگوں سے مختلف نہیں دکھائی دیتے جو پرویز کو دیکھ کر نعرے لگایا کرتے تھے۔"

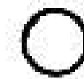
ویلریس نے قدرے برہم ہو کر کہا۔ "تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ قیصر اور اس کی رعایا کو اپنی فتح اور ایرانیوں کی شکست پر خوش نہیں ہونا چاہیے؟"

"نہیں، میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ فتوحات جو انسانوں کو دیوتاؤں کا غرور عطا کرتی ہیں، امن

کی بجائے ہمیشہ نئی جنگوں کے راستے کھولتی ہیں۔ میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ امن کا راز کسی ایک انسان کسی ایک قوم یا کسی ایک ملک کی کسی دوسرے انسان، کسی دوسری قوم یا کسی دوسرے ملک پر فتح یا بالادستی میں نہیں، بلکہ تمام انسانوں پر کسی ایسے نظام کی فتح میں ہے جو طاقتور کو کمزور کی حفاظت اور نگہبانی سکھاتا ہو۔ لیکن تمہیں میری باتوں سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک دیوانے کا خواب ہے۔ اور اس دنیا میں اس کی تعبیر ممکن نہیں۔ یہاں ظالم مظلوم اور مظلوم ظالم بنتے رہیں گے۔ ہمیں مستقبل کے متعلق سوچنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اپنے حصے کے آلام و مصائب جھیل چکے ہیں۔ اب جنگ ختم ہو چکی ہے اور ہمیں یہ امید رکھنی چاہیے کہ قیصر اپنی ان فتوحات پر قناعت کرے گا اور ہماری زندگی کے باقی سال امن سے گزر جائیں گے۔ پھر اگر کسی دن کسی نئے قیصر کے دل میں پرویز کی روح بیدار ہو گی یا ایران کی زمین سے کوئی نیا اژدہا اٹھے گا تو ہم یہ دیکھنے کے لیے اس دنیا میں موجود نہیں ہوں گے کہ ہمارے بعد آنے والوں پر کیا گزرتی ہے۔"

ولیریس کی آنکھوں میں شراب کا خمار جھلک رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "تمہاری باتوں کی داد صرف کلاڈیوس دے سکتا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اب چلو آج تمہیں ہرقل کی تقریر ضرور سننی چاہیے۔"

عاصم نے کہا۔ "نہیں تم جاؤ ——— میں اب سیدھا کلاڈیوس کے گھر جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے کہ فسطینیہ وہیں ہو۔ اور اگر وہ وہاں نہ ہوئی تو بھی میرے لیے وہاں بیٹھ کر انتظار کرنا زیادہ آسان ہو گا ———"



کلاڈیوس کے گھر میں ایک بوڑھے نوکر کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس نے غور سے عاصم کی طرف دیکھا اور کہا۔ "آپ عاصم ہیں؟ معاف کیجیے میں آپ کو پہچان نہیں سکا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ آگئے ہیں۔ کلاڈیوس اور ان کے والد کو قیصر کے بعد سب سے زیادہ آپ کا انتظار تھا۔ وہ سب قیصر کا جلوس دیکھنے گئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔ آپ تشریف رکھیں وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

عاصم نے سوال کیا۔ "فسطینیہ کیسی ہے؟"

"جی، اس کی ماں مر گئی تھی اور وہ ابھی تک اس کا غم نہیں بھول سکی۔ وہ آپ کے لیے بھی تڑپا ہر روز گرجے میں جا کر دعا کیا کرتی ہے۔ میں اکثر اس کے ساتھ جایا کرتا ہوں اور میں نے دعا کے وقت اکثر اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ہیں۔ اگر آپ تھوڑی دیر پہلے آجاتے تو وہ یہیں تھی۔ انطونیہ اور جولیا کے اصرار کے باوجود وہ ان کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ اسے اب گرجے اور قبرستان کے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہی۔ جب وہ چلی گئیں تو اس نے مجھ سے کہا کہ میں گرجے جا رہی ہوں۔ میں نے کہا۔ آج وہاں کوئی نہیں ہو گا اور شاید گرجے کا دروازہ بھی بند ہو۔ وہ کچھ دیر بیٹھی رہی اور پھر اچانک اٹھ کر بولی۔ "میں قبرستان کی طرف جا رہی ہوں۔" پھر اس نے چند پھول توڑے اور باہر نکل گئی۔ اگر گھر میں کوئی ہوتا تو میں یقیناً اس کے ساتھ جاتا۔ آپ اطمینان سے بیٹھیں۔ وہ بہت جلد آجائے گی۔ قبرستان زیادہ دور نہیں۔"

"وہ کون سے قبرستان کی طرف گئی ہے؟"

"وہ قبرستان مغربی دروازے کے باہر ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا۔ آپ تشریف رکھیں۔ میں اُسے بلا لاتا ہوں۔"

"نہیں، میں خود وہاں جانا چاہتا ہوں۔" عاصم یہ کہہ کر واپس مڑا۔ بیرونی دروازے کے قریب اس نے ایک کیاری سے گلاب کے چند پھول توڑے اور باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ مغربی دروازے سے باہر ایک قبرستان کے اندر داخل ہوا۔ وہاں ایک ٹیلے کے دامن میں اسے دور سے ایک سیاہ پوش عورت دکھائی دی۔ وہ بھاگ کر آگے بڑھا، رکا، پھر کبھی تیز اور کبھی سست رفتار سے ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اور اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ فسطینیہ نے اچانک مڑ کر دیکھا۔ اور عاصم کے پاؤں زمین سے پیوست ہو کر رہ گئے۔ چند ثانیے وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر زندگی کے پرسکون سمندر میں اچانک ایک طوفان اٹھا۔ اور وہ بے اختیار ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

عاصم نے کہا۔ "فسطینیہ! میں آگیا ہوں۔ میں زندہ ہوں۔ اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔"

اور قسطنیہ کے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے سسکیوں کے سوا اور کوئی آواز نہ نکلی ——— پھر یہ دبی دبی سسکیاں بلند ہونے لگیں اور عاصم اپنے سینے پر اس کے آنسوؤں کی نمی محسوس کرنے لگا۔

اچانک اس نے ایک ہچکی لی اور عاصم سے جدا ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

عاصم نے آگے بڑھ کر ایک ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"قسطنیہ میری طرف دیکھو۔ میں سچ مچ زندہ ہوں۔"

لیکن قسطنیہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور ایک بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

عاصم نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "کاش میں تمہاری کھوئی ہوئی مسرتیں واپس لا سکتا۔ یہ تمہاری ماں کی قبر ہے؟"

اس نے عاصم کی طرف دیکھے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور عاصم نے آگے بڑھ کر قبر پر گلاب کے پھول رکھ دیے۔ اور پھر قسطنیہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "قسطنیہ! میں جانتا ہوں کہ میری محبت نے تمہیں آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں دیا۔ لیکن اپنے مقدر کی تاریکیوں میں تمہاری آنکھوں کی روشنی میرا آخری سہارا تھا۔ قسطنیہ میری طرف دیکھو۔"

قسطنیہ اپنے آنسو پونچھنے کے بعد اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ "عاصم میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں بیٹھ جاؤ ———!"

وہ گھاس پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے ——— اور قسطنیہ نے کچھ دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد کہا۔ "میں اسی دن کے لیے دعائیں کیا کرتی تھی۔ اور میری سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ مرنے سے پہلے ایک بار تمہیں دیکھ لوں۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔ اب مجھے خدا کے ساتھ اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے تمہارے سہارے کی ضرورت ہے۔ میری بات غور سے سنو عاصم! اپنے باپ کی المناک موت کی خبر سننے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ انہیں میرے گناہ کی سزا ملی ہے اور میرا گناہ یہ تھا کہ میں نے ایک راہبہ کی مقدس زندگی پر دنیاوی زندگی کی لذتوں کو ترجیح دی تھی۔ میں

یروشلم کی سب سے بڑی خانقاہ کے بشپ کی باتوں کا مذاق اڑایا تھا ——— میں نے راہبہ بننے سے اس لیے انکار کیا تھا کہ میرا باپ ایران کی فوج کا ایک بہت بڑا عہدہ دار تھا۔ اور میں ایک عیسائی ماں کی بیٹی ہونے کے باوجود ایک فاتح قوم کے ساتھ تعلق رکھتی تھی۔ میری ماں کو بھی یہ بات پسند نہ تھی کہ میں جیتے جی اس دنیا سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ وہ خانقاہ کو قبر سے زیادہ بھیانک سمجھتی تھی۔ لیکن مرتے وقت اسے بھی اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ مجھے راہبہ بننے سے روکنا اس کی زندگی کا سب سے بڑا گناہ تھا۔ ماں کی موت کے بعد میں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کا قصد کر چکی تھی۔ صرف تمہارا خیال میرا راستہ روکے ہوئے تھا۔ انطونیہ مجھے سمجھایا کرتی تھی کہ جب عاصم واپس آئے گا تو تمہارے بغیر اس کا کیا حال ہو گا ——— راہبہ بننے کے بعد تم اس کے ساتھ ملاقات تک نہیں کر سکو گی ——— پھر جب تم نہ آئے تو میں نے یہ محسوس کیا کہ تمہاری قید کی طوالت بھی شاید میرے گناہ کا نتیجہ ہے۔ قدرت کو یہ منظور نہیں کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکیں چنانچہ میں ایک دن خانقاہ میں چلی گئی ——— لیکن وہاں میں نے خواب میں دیکھا کہ تم آ گئے ہو اور میں وہاں سے بھاگ آئی ——— لیکن خانقاہ چھوڑتے وقت میں نے یہ حلف اٹھایا تھا کہ اگر تم واپس آ گئے تو میں راہبہ بن جاؤں گی۔ آج خدا نے میری دعائیں سن لی ہیں اور میں خدا کے ساتھ اپنا وعدہ پورا کروں گی۔ اگر اب میرا ارادہ متزلزل ہوا تو میرا انجام عبرتناک ہو گا۔ میں شاید اپنے لیے ہر سزا برداشت کر سکوں۔ لیکن میں یہ گوارا نہیں کروں گی کہ میری وجہ سے تم عذاب میں مبتلا ہو جاؤ۔"

عاصم نے کرب انگیز لہجے میں کہا۔ "میرے لیے اس سے بڑا عذاب کیا ہو سکتا ہے کہ میں زندہ رہوں لیکن میری آنکھیں تمہیں نہ دیکھ سکیں اور میرے کان تمہاری آواز نہ سن سکیں۔"

قسطنیہ کرب انگیز لہجے میں چلائی۔ "عاصم خدا کے لیے میری طرف اس طرح نہ دیکھو ——— دنیا میں صرف تم ہی مجھے اپنی زندگی کی سب سے بڑی آزمائش میں پورا اترنے کے لیے سہارا دے سکتے ہو ——— میں آج غروب آفتاب سے قبل خانقاہ میں چلی جاؤں گی۔ اور اس سے قبل میں تمہاری زبان سے صرف یہ سننا چاہتی ہوں کہ تم مجھے بھول جاؤ گے۔"

عاصم نے کہا۔ "ایک انسان اپنی موت سے پہلے نہیں مر سکتا اور ابھی شاید میری موت کا وقت

ترتیب نہیں آیا۔ فسطینہ میری بات غور سے سنو۔ قید کے ایام میں میری زندگی کا کوئی لمحہ تمہارے تصور کے بغیر نہ تھا۔ تاہم اگر مجھے اس بات کا یقین ہو جائے کہ تم میرے بغیر زیادہ خوش رہ سکتی ہو تو میں یہیں سے الٹے پاؤں واپس چلا جاؤں گا۔ ویرانوں میں بھٹکنا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ تمہاری خانقاہ کی تاریکیاں میرے قید خانے کے اندھیروں سے زیادہ بھیانک ہوں گی۔ تم سین کی بیٹی ہو اور میں تمہیں ان راہبوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر نہیں جاؤں گا جو انسانیت کی تذلیل کو سب سے بڑی نیکی سمجھتے ہیں۔"

"لیکن یہ تذلیل میرے گناہوں کا کفارہ ہو گی۔"

"فسطینہ!" اس نے جوش میں آکر کہا۔ "تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ اور دنیا میں کسی کو یہ حق نہیں کہ تمہیں جیتے جی قبر میں دھکیل دے۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں فسطینہ! اور تمہاری خانقاہ میرا دل ہے۔ نہیں انطونیہ اور کلاڈیوس نے یہ نہیں بتایا کہ خانقاہوں میں انسانوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے——؟ تم نے ان راہبوں کو نہیں دیکھا جن کی صورتیں بگاڑ دی جاتی ہیں۔ فسطینہ مجھ سے یہ تو ممکن ہے کہ میں کسی شہزادے کو پکڑ کر تمہارے سامنے لے آؤں اور یہ کہوں کہ یہ مجھ سے زیادہ حسین، زیادہ بہادر اور زیادہ متمول ہے اور اس کی رفاقت میں تمہیں وہ راحتیں مل سکتی ہیں جو مجھ جیسا عزیب الدیار نہیں دے سکتا۔ لیکن خدا کی قسم! اگر یہ خانقاہوں کے راہب ہوا میں اڑ کر دکھائیں تو بھی میں یہ تسلیم نہیں کروں گا کہ وہ خدا کی طرف سے ایک حسین صورت کو مسخ کرنے کا حق لے کر آئے ہیں۔ تم جس خانقاہ میں جاؤ گی اس کے آہنی دروازے بھی میرا راستہ نہیں روک سکیں گے۔ میں اپنی بے بسی اور بے چارگی کے باوجود تمہیں یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ تم صرف میری لاش پر پاؤں رکھ کر وہاں جا سکو گی——"

فسطینہ نے آب دیدہ ہو کر کہا۔ "میرا خیال تھا کہ تم مجھے حوصلہ دو گے۔ لیکن تم میری مشکل میں اضافہ کر رہے ہو۔"

عاصم نے اس کے قریب ہو کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "فسطینہ! آج تم اس لڑکی سے زیادہ نادان ہو جس نے میرے ساتھ یروشلم سے دمشق تک سفر کیا تھا۔ اور آج تمہیں میری رفاقت کی زیادہ ضرورت ہے——میں تمہارا ہر گناہ اپنے سر لینے کے لیے تیار ہوں۔ تم میری ہو فسطینہ۔"

فسطینہ بے اختیار عاصم کے ساتھ لپٹ گئی اور اپنا چہرہ اس کے کشادہ سینے کے ساتھ بھینچ کر بولی۔ "عاصم میں ہمیشہ تمہاری تھی مجھے اپنے سینے میں چھپا لو۔ مجھے ایسی جگہ لے چلو جو خوف سے آزاد ہو——میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں اپنے آپ کو دھوکا دے رہی تھی۔ اگر ہمارے مقدر میں صرف آگ ہے تو ہم ایک ساتھ کیوں نہ جلیں۔ تم میرے ہو۔ تم میرے ہو——اب مجھے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔ میں وہی ہوں جس نے تمہارے ساتھ دمشق تک سفر کیا تھا۔ اسی قدر کمزور اور بے بس۔ لیکن مجھے خوف محسوس نہیں ہوتا۔ تم یہاں کیسے پہنچ گئے——تم گھر گئے ہو گے اور بوڑھے نوکر نے تمہیں بتایا ہو گا کہ وہ بیوقوف لڑکی قبرستان میں گھوم رہی ہو گی——میں ہرقل کا جلوس دیکھنے نہیں گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تم آ رہے ہو——"

وہ مسکرا رہی تھی اور عاصم کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو رہی تھیں۔

پھر وہ یکایک اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے حسین چہرے پر ایک مصنوعی غصہ لاتے ہوئے بولی۔ "تم نے یہ کیا کہا تھا کہ تم کسی شہزادے کو میرے سامنے لا کر یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ تمہارے لیے بہتر ہے؟ کیا تم میرے شہزادے نہیں ہو——؟"

عاصم نے اس کے بالوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے معلوم نہیں کہ میں کیا ہوں۔ لیکن میں تمہارا ہوں۔"

پھر وہ ایک دوسرے کو اپنی اپنی سرگزشت سنا رہے تھے۔ سورج سر پر آ گیا تو وہ اٹھ کر چنار کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔

فسطینہ نے کہا۔ "تمہیں بھوک لگی ہو گی۔ چلو گھر چلیں۔"

"مجھے اب بھوک یا تھکاوٹ کا احساس نہیں رہا۔ اور گھر جانے سے پہلے میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہیں ایک ایسے آدمی کی بیوی بننا منظور ہے۔ جسے یہ دنیا تمہاری محبت کے سوا کچھ نہیں دے سکتی۔"

فسطینہ نے جواب دیا۔ "کیا اب یہ سوال بے معنی معلوم نہیں ہوتا؟"

عاصم نے کہا۔ "فسطینہ! میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہماری شادی کب اور کہاں ہو گی۔ اور اس کے

بعد تم کہاں رہنا پسند کرو گی؟

"میں صرف یہ جانتی ہوں کہ یہ باتیں تم مجھ سے بہتر سوچ سکتے ہو۔"

"عاصم بولا۔" اگر میں یہ کہوں کہ ہمیں آج ہی شادی کر لینی چاہیے۔ تو؟"

"فسطینہ نے جواب دیا۔ "عاصم میں راہبہ بننے کی قسم توڑ چکی ہوں۔ اب اگر تم کلاڈیوس کے گھر جا کر یہ اعلان کر دو کہ ہماری شادی ہو چکی ہے تو بھی میں شرم محسوس نہیں کروں گی۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ تمہاری آمد کی اطلاع ملتے ہی خانقاہ کے راہب میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ اور ان کے عتاب کے خوف سے شہر کا کوئی پادری ہماری شادی کی رسومات ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہو گا۔ ہمارے خلاف عام لوگوں کو مشتعل کرنے کے لیے ان کا یہ کہہ دینا کافی ہو گا کہ میں عیسائی ہوں اور تمہارا مذہب مجھ سے الگ ہے کاش میں یہ کہہ کر ان کا منہ بند کر سکتی کہ تم قسطنطنیہ کے تمام عیسائیوں سے بہتر ہو۔"

عاصم نے کہا۔ "عرب میں میرا مذہب چند ایسی مضحکہ خیز رسومات کا مجموعہ تھا جنہیں اب بیان کرتے ہوئے بھی مجھے شرم محسوس ہوتی ہے۔ ہم حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے رب کو ماننے کے علاوہ کئی اور خداؤں کے بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ اور ان خداؤں کے ساتھ ہماری عقیدت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہم لوٹ مار، قتل و غارت اور دشمن قبائل سے اپنے قبیلے کی طاقت کا لوہا منوانے کے لیے ان کی اعانت کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ میں بھی یثرب کے دوسرے لوگوں کی طرح مناۃ کے بت کی پوجا کیا کرتا تھا۔ یہ ایک بے جان پتھر تھا۔ لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ مجھے اپنے دشمن قبیلے کو مغلوب کرنے اور اپنے عزیزوں کے قاتلوں سے انتقام لینے کی قوت عطا کر سکتا ہے۔ اب اپنے قبیلے سے محبت، اطاعت اور وفاداری کے تمام رشتے توڑنے کے بعد میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ عرب کے تمام بڑے اور چھوٹے خداؤں کے ساتھ بھی میرے رشتے ختم ہو چکے ہیں۔ اب مجھے کسی کا خون بہانے کے لیے ان کی اعانت کی ضرورت نہیں۔ تم یہ کہہ سکتی ہو کہ اب میرا کوئی مذہب نہیں مجھے کسی ایسے دین کی تلاش تھی جو ایک انسان کو دوسرے انسان، ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے یا ایک قوم کو دوسری قوم کے ظلم سے بچا سکتا ہو۔ اپنا وطن چھوڑنے سے قبل میں مکہ میں ایک نبیؐ کے ظہور کے متعلق سنا کرتا تھا۔ لیکن میرے لیے یہ بات ناقابل یقین تھی

کہ عرب کے صحرا سے کوئی چشمہ پھوٹ سکتا ہے لیکن اس نبی کی ایک بات میرے لیے حیران کن ہے جب کسریٰ پرویز کا غرور اور قیصر کی بے بسی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی تو میں نے یہ سنا تھا کہ اس نے رومیوں کی فتح اور ایرانیوں کی شکست کی پیش گوئی کی ہے۔ مرتے وقت تمہارے باپ کو اس پیش گوئی کی صداقت کا یقین تھا۔ میں نے اس نبی کو نہیں دیکھا۔ لیکن میں عرب کے حالات سے واقف ہوں۔ وہاں کسی ایسے دین کا پنپنا ممکن نہیں جو انسانیت کی بھلائی چاہتا ہو۔ ممکن ہے کہ مکہ کا نبی غیب کے حالات جانتا ہو۔ لیکن اگر وہ ساری دنیا کو سلامتی کا پیغام دینے کی بجائے صرف عرب کے قبائل کے درمیان نفرت کی دیواریں مسمار کرنے میں کامیاب ہو گیا تو بھی میں اسے انسانی تاریخ کا ایک عظیم ترین معجزہ سمجھوں گا۔

بظاہر ہماری زندگی میں ایسا وقت نہیں آ سکتا کہ عرب کے ظلمت کدے سے کوئی روشنی نمودار ہو کر مشرق اور مغرب میں پھیل جائے۔ لیکن اگر یہ ہوا تو ایسے دین کا جھنڈا اٹھانا اپنی زندگی کی سب سے بڑی سعادت سمجھوں گا۔ سردست میرے لیے تمام مذاہب ایک جیسے ہیں۔ اور اگر میرے عیسائی کہلانے سے تمہاری الجھن دور ہو سکتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

فسطینہ نے کہا۔ "راہبہ بننے کا ارادہ توڑنے کے بعد میں اپنے دین کی مجرم بن چکی ہوں۔ اب میرے لیے یہ مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ تمہارا مذہب کیا ہے اور میرے نزدیک اس وقت بھی اس سوال کی کوئی اہمیت نہ تھی جب ہم پہلی بار ملے تھے۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ تم جو کچھ بھی ہو میرے ہو اور تمہاری موجودگی میں مجھے کوئی ڈر یہاں تک کہ کلیسا کا ڈر بھی محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن شادی کے لیے ہمیں یہاں کے قانون کے تقاضے پورے کرنے پڑیں گے۔ اس کے راہبوں کی نگاہوں سے بچنے کیلئے مجھے قسطنطنیہ چھوڑنا پڑے گا۔ انطونیہ یہ کہتی تھی کہ مجھ سے راہبہ بننے کا مطالبہ کرنے والوں کو دولت کا لالچ ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایران کے سپہ سالار کی بیٹی کوئی بہت بڑا خزانہ اپنے ساتھ لائی ہے۔ میں اپنی ماں کی موت کے چند دن بعد اپنی ساری پونجی ایک خانقاہ کو پیش کرنا چاہتی تھی۔ لیکن انطونیہ نے میرے ہیرے اور زیورات چھین کر اپنے پاس رکھ لیے تھے اور وہ یہ کہا کرتی تھی کہ تمہاری شادی تک یہ امانت میرے پاس رہے گی ——— اسے یہ بھی یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔ پھر میں یہ سوچا کرتی تھی کہ اگر تم واقعی ایس

آ گئے تو میری پونجی تمہارے کام آئے گی۔ چنانچہ ایک دن چوری چھپے خانقاہ جانے سے پہلے میں انطونیہ سے یہ وعدہ لیا کہ اگر مجھے کوئی حادثہ پیش آگیا تو وہ میرا سرمایہ تمہارے حوالے کر دے گی ـــــ جب میں دو دن کے لیے خانقاہ میں گئی تھی تو بشپ بار بار مجھ سے یہ کہتا تھا کہ اگر تم اپنی کوئی چیز پیچھے چھوڑ آئی ہو تو اس کا یہ مطلب ہوگا۔ تم نے ابھی تک دنیا سے اپنے تعلقات قطع نہیں کیے ـــــ مجھے مجبوراً یہ وعدہ کرنا پڑا کہ راہبہ بننے کا آخری حلف اٹھانے سے پہلے میں اپنی ساری پونجی یہاں لے آؤں گی۔ پھر میں وہاں سے بھاگ آئی۔ اس کے بعد وہ کئی بار کلاڈیوس کے گھر آ کر مجھے ملامت کر چکا ہے ـــــ انطونیہ نے یہ کہہ کر بڑی مشکل سے میرا پیچھا چھڑایا تھا کہ فسطینہ کا ایک عزیز ایرانیوں کی قید میں ہے۔ اور اس کی واپسی تک یہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی ـــــ وہ انطونیہ پر بھی بہت برہم ہوتا۔ لیکن جب میں نے یہ وعدہ کیا کہ اگر عاصم زندہ واپس آگیا تو میں راہبہ بننے کا وعدہ پورا کروں گی تو اس کا غصہ جاتا رہا۔

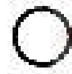
اس کے بعد بشپ بذاتِ خود کلاڈیوس کے گھر نہیں آیا۔ لیکن وہ ہر مہینے دو تین مرتبہ ایک راہبہ کو میرے پاس ضرور بھیج دیتا ہے۔ خدا معلوم قسطنطنیہ کی دو اور خانقاہوں کے راہبوں کو میرے حالات کا کیسے علم ہو گیا کہ چند ماہ سے وہ بھی میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ہر خانقاہ کے مبلغ میرے پاس آ کر جس جوش و خروش کے ساتھ اپنے پیشواؤں کے معجزات بیان کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ وہ دوسری خانقاہوں کے راہبوں کی مذمت کرتا ہے۔ ایک دوسرے کے خلاف الزامات سن کر مجھے تعجب ہوتا ہے۔"

عاصم نے کہا۔ "تو اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمیں آج ہی یہاں سے بھاگنے کی فکر کرنی چاہیے۔ ورنہ یہ عجب نہیں کہ قسطنطنیہ کی تمام خانقاہوں کے راہب جمع ہو جائیں اور کلاڈیوس کا گھران کی جنگ کا اکھاڑہ بن جائے ـــــ"

فسطینہ نے کہا۔ "نہیں، تمہیں اس قدر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری شادی کی مخالفت میں کوئی طوفان نہیں اٹھے گا۔ بشپ سائمن جو تمہارے ساتھ دست گرد کیا تھا، مجھ پر بہت مہربان ہے۔ اس کی نگاہ میں میرے والد عیسائیت کے بہت بڑے محسن تھے۔ اس نے

کئی بار کلاڈیوس کے گھر آ کر مجھے تسلی دی ہے کہ ایک دن وہ شہنشاہ کا تحریری فرمان لے کر آیا تھا جس کی رو سے میں دمشق میں اپنے نانا کی ساری جائیداد کی وارث ہوں۔ اور اس نے مجھے یہ کہا تھا کہ اگر تم وہاں جانا چاہتی ہو تو میں تمہارے لیے جہاز کا انتظام کر سکتا ہوں۔ ـــــ وہ تمہاری بھی بے حد عزت کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہم ان کے پاس چلے جائیں تو وہ ہماری شادی کے لیے یہ پوچھنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کریں گے کہ تمہارا مذہب کیا ہے۔ لیکن راہبہ بننے کے متعلق میرے عوام اس قدر مشہور ہو چکے ہیں کہ ہمارے لیے قسطنطنیہ میں رہنا مشکل ہو جائے گا ـــــ میں اپنے لیے نہیں، لیکن آپ کے لیے ان راہبوں کی بد دعاؤں سے ضرور ڈرتی ہوں۔"

عاصم نے کہا۔ "فسطینہ جب تک تم میرے ساتھ ہو۔ میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم قسطنطنیہ میں رہتے ہیں یا دمشق میں۔ اگر سائمن زندہ ہے تو میں اس کی شرافت پر اعتماد کر سکتا ہوں۔ اب چلو۔ ہمیں شام سے پہلے بہت کچھ کرنا ہے۔"



بشپ سائمن جوڑوں میں درد کے باعث بستر پر لیٹا کراہ رہا تھا۔ ایک نوکر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ "مقدس باپ! چند آدمی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

سائمن نے جھلا کر کہا۔ "بیوقوف تم نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ مقدس باپ اس وقت نزع کے عالم میں ہے۔"

"جناب میں نے انہیں سمجھایا تھا کہ آپ بستر پر لیٹے ہوئے ہیں لیکن وہ آپ کو دیکھنے پر مصر ہیں میں نے انہیں ملاقات کے کمرے میں بٹھا دیا ہے۔"

"خدا تمہیں غارت کرے وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ میں بستر پر آرام سے لیٹا ہوا ہوں۔"

"جناب میں نے انہیں یہ بھی سمجھایا تھا کہ آپ کو سخت تکلیف ہے۔ لیکن وہ یہ کہتے تھے، کہ آپ کا کوئی دوست جسے دست گرد میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ واپس آگیا ہے۔ اس کا نام عاصم ہے

جب میں نے یہ کہا کہ اس وقت ملاقات نہیں ہو سکتی تو وہ یہ کہتے تھے کہ اگر آپ کا دوست آپ سے ملے بغیر واپس چلا گیا تو آپ سخت خفا ہوں گے۔“

سائمن نے جلدی سے اٹھ کر اپنی لاٹھی سنبھالی اور باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ”خدا کی قسم! اگر وہ ملے بغیر چلا جاتا۔ تو میں تمہاری کھال اتروا دیتا۔“

وہ ملاقات کے کمرے میں داخل ہوا۔ کلاڈیوس، ولیریس اور عاصم اٹھ کر کھڑے ہو گئے —— سائمن نے اپنی لاٹھی ایک طرف پھینک دی اور عاصم سے بغلگیر ہو کر کہا۔ ”میرے لیے تمہاری آمد کی خوشی قیصر کی آمد کی خوشی سے کم نہیں۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ولیریس تمہیں اتنی جلدی واپس لے آئیگا۔“

ولیریس نے کہا۔ ”مقدس باپ یہ مجھے انطاکیہ سے چند منازل دور راستے میں مل گئے تھے۔“

وہ بیٹھ گئے اور جب عاصم نے سائمن کے سوالات کے جواب میں مختصراً اپنی سرگذشت بیان کر دی۔ تو اس نے کہا۔ ”میں بیمار تھا۔ لیکن اب مجھے اس بات کا افسوس نہیں کہ میں قیصر کا جلوس نہیں دیکھ سکا۔“

عاصم نے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ ہم نے آپ کو بے وقت تکلیف دی۔“

”نہیں نہیں، میرے لیے اس سے بڑی راحت کیا ہو سکتی ہے۔ ایک لمحہ پیشتر میں درد سے کراہ رہا تھا۔ اور اب مجھے اس کا احساس بھی نہیں رہا۔ اب بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں میں نے تیس سالہ پرانی شراب کا ایک مٹکا سنبھال کر رکھا ہوا ہے —— اور تم اور تمہارے دوستوں سے زیادہ اس کا کوئی اور حق دار نہیں ہو سکتا۔“

عاصم نے جواب دیا۔ ”آپ کو معلوم ہے کہ میں شراب نہیں پیتا۔ اور میرے دوستوں کی آنکھیں اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ وہ ایک دن کی ضرورت سے زیادہ پی چکے ہیں۔“

”اُف مجھے یہ بات یاد نہیں رہی کہ تم شراب ترک کر چکے ہو۔ اچھا یہ بتاؤ۔ میں اس وقت اور کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

عاصم نے کلاڈیوس کی طرف دیکھا اور اُس نے کہا۔ ”مقدس باپ! عاصم کی سب سے بڑی

خواہش یہ ہے کہ اس کی شادی کی رسومات آپ کے گرجے میں ادا ہوں —— لیکن بدقسمتی سے آپ علیل ہیں۔“

سائمن مسکرایا۔ ”اگر کسی اور کی شادی کا مسئلہ ہوتا تو میں یہ جواب دیتا کہ میں قریب المرگ ہوں۔ لیکن عاصم کا معاملہ مختلف ہے۔ پھر وہ عاصم کی طرف متوجہ ہوا —— ”بیٹا اگر میں غلطی پر نہیں، تو تمہاری دلہن سین کی بیٹی ہے —— وہ کلیسا کا ایک بہت بڑا محسن تھا۔ اور اس کی بیٹی کی شادی کی رسومات ادا کرنا میں اپنی زندگی کا اہم ترین واقعہ سمجھوں گا۔ تم کل صبح ہوتے ہی میرے گرجے میں پہنچ جاؤ۔ اگر میں زندہ ہوا تو وہاں مجھے موجود پاؤ گے۔ مجھے فسطینہ کی الجھنوں کے متعلق کچھ علم ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ تم آ گئے ہو ——“

عاصم نے کہا۔ ”آپ کو تکلیف ہو گی۔ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ ہم صبح یہیں حاضر ہو جائیں۔“

”نہیں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو گی —— اور اگر تم کوئی اور خدشہ محسوس کرتے ہو تو میں تمہیں یہ تسلی دے سکتا ہوں کہ میرا گرجا میرے گھر سے کم محفوظ نہیں۔“

اگلی صبح سائمن کے گرجے میں عاصم اور فسطینہ کی شادی کی رسومات ادا ہو رہی تھیں۔ اور اس رات کلاڈیوس کے گھر میں ایک شاندار دعوت کا اہتمام ہو رہا تھا —— جب کوئی دو سو مہمان ایک وسیع دستر خوان پر بیٹھ گئے تو ایک بگھی مکان کے دروازے پر رکی۔ دو آدمیوں نے لکڑی کا ایک بھاری مٹکا بگھی سے اتارا اور اُسے اٹھا کر صحن میں داخل ہوئے۔ پھر بگھی سے ایک پادری اترا اور لاٹھی کے سہارے چلتا ہوا ان کے پیچھے ہو لیا —— یہ سائمن تھا۔ کلاڈیوس نے جلدی سے اٹھ کر اس کا خیر مقدم کیا۔ سائمن نے دستر خوان پر بیٹھتے ہوئے کلاڈیوس کے باپ سے کہا۔ ”مرقس تمہارے دستر خوان پر کسی چیز کی کمی نہیں۔ لیکن پرانی شراب کا یہ مٹکا میں نے تیس سال سے کسی اہم موقع کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا تھا —— اور میرے نزدیک اس مٹکے کو کھولنے کے لیے اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ ہم جس شخص کی شادی کی دعوت کر رہے ہیں وہ ایک عرب ہونے کے باوجود شراب نہیں پیتا۔ لیکن مجھے امید ہے کہ اس کے مہمان مجھے مایوس

نہیں کریں گے ——"

رومی سینٹ کے ایک رکن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مقدس باپ! اگر اس مٹکے میں پانی نہیں تو ہم یقیناً آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔"

آدھی رات کے قریب کلاڈیوس کا گھر مہمانوں سے خالی ہو چکا تھا۔ اور تھوڑی دیر بعد عاصم بالاخانے کے ایک کمرے میں قسطنیہ سے کہہ رہا تھا۔ "قسطنیہ ہم زندہ ہیں۔ ماضی کے آلام و مصائب کی چکی میں پسنے کے باوجود ہم زندہ ہیں۔"

اور قسطنیہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آج ہمیں ماضی کے متعلق نہیں سوچنا چاہیے۔ ہم اس گرداب سے نکل چکے ہیں۔ اور ہمیں مستقبل کے متعلق بھی سوچنے کی ضرورت نہیں۔"

"مجھے کل اور آج کے تمام واقعات ایک خواب محسوس ہوتے ہیں۔"

"یہی ایک خواب ہماری زندگی کا حاصل ہے۔ کاش زمانے کی گردش ختم جائے اور ہم کبھی اس خواب سے بیدار نہ ہوں ——"

"لیکن قسطنیہ اس دنیا میں آج بھی بے شمار لوگ ایسے ہوں گے جو حال کی مایوسیوں میں مستقبل کی امیدوں کا سہارا لے رہے ہوں گے۔ اور کئی ایسے بھی ہوں گے جن کے مستقبل کا تصور حال سے زیادہ بھیانک ہوگا۔ جن کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوگی کہ زندگی کے مہ و سال ایک آنکھ جھپکنے کی دیر میں گزر جائیں —— کبھی مجھے بھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وقت انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔"

قسطنیہ نے جواب دیا۔ "ہم جس دور سے گزرے ہیں وہ واقعی انسان کا دشمن تھا۔ لیکن آج ہم یہ کیوں نہ سوچیں کہ ہمارے مستقبل کے راستے میں وہ بھنور نہیں ہوں گے۔ جن میں پھنسنے کے بعد انسان وقت کو اپنا دشمن خیال کرتا ہے۔ بلکہ ہمارے راستے میں وہ حسین وادیاں ہوں گی۔ جن سے گزرتے ہوئے ہم یہ محسوس کریں گے کہ کاش وقت کی رفتار اتنی تیز نہ ہوتی ——"

"یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب کہ قدرت دنیا میں کسی ایسے معلم کو بھیج دے جو انسانوں کو زندگی کے نئے آداب سکھا سکتا ہو —— جو ہر انسان کو یہ احساس عطا کر دے کہ وہ دوسروں

کے لیے آنسوؤں کے نہیں بلکہ مسکراہٹوں کے سامان پیدا کرنے کے لیے آیا ہو۔"

"تم پھر کسی نبی کے متعلق سوچ رہے ہو؟"

عاصم نے جواب دیا —— "ایک انسان اپنی سب سے بڑی احتیاج کے متعلق سوچے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

قسطنیہ مسکرائی —— "اس وقت میری سب سے بڑی احتیاج یہ ہے کہ تم صرف میری طرف دیکھتے رہو۔"

باب ۱۴

شادی سے پانچ دن بعد ایک شام عاصم اور فسطینہ کچھ دیر باہر گھومنے کے بعد واپس آئے تو کلاڈیوس، انطونیہ، جولیا، مرقس اور ولیریس مکان کے ایک کشادہ کمرے میں بیٹھے اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ فسطینہ انطونیہ اور جولیا کے درمیان بیٹھ گئی اور کلاڈیوس نے عاصم کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا "میں اور ولیریس ابھی قبرستان سے ہو کر آئے ہیں۔ لیکن تم وہاں نہیں تھے۔"

عاصم نے جواب دیا "میں فسطینہ کی ماں کی قبر دیکھنے کے بعد دوسرے قبرستان میں فرمس کی قبر پر چلا گیا تھا۔"

انطونیہ نے شکایت کے لہجے میں کہا "اگر آپ اباجان کی قبر پر جا رہے تھے۔ تو مجھے ساتھ کیوں نہ لے گئے ہو؟"

عاصم نے جواب دیا "میرا خیال تھا کہ میں کل وہاں جاؤں گا۔ لیکن گھر سے نکلنے کے بعد مجھے یاد آیا کہ کل ہمیں سفر کی تیاری کرنی ہے، اس لئے شاید فرصت نہ ملے، چنانچہ فسطینہ کی ماں کی قبر کی زیارت کے بعد ہم وہاں چلے گئے۔"

کلاڈیوس نے کہا "اباجان کو آپ کا اتنی جلدی دمشق جانا پسند نہیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ آپ چند ہفتوں کے لئے رُک جائیں۔ ممکن ہے کہ مجھے قیصر کے ساتھ یروشلم جانا پڑے اور ہم یہاں سے اکٹھے روانہ ہوں؟"

"نہیں ہم دمشق پہنچ کر آپ کا انتظار کریں گے، اس وقت آپ مجھے سفر کا ارادہ ملتوی کرنے پر مجبور نہ کریں۔"

مرقس نے کہا "بیٹا اگر تم اس خوف سے بھاگ رہے ہو کہ راہب تمہاری بیوی کو زبردستی پکڑ کر خانقاہ میں لے جائیں گے تو میں اُس کی حفاظت کا ذمہ لینے کے لئے تیار ہوں ـــــ شاید آپ کو یہ معلوم نہیں کہ ایک شادی شدہ عورت راہبہ نہیں بن سکتی۔"

عاصم نے جواب دیا "جناب آپ کی پناہ میں رہتے ہوئے مجھے راہبوں کا خوف نہیں، لیکن آپ کو ہمیں یہاں ٹھہرانے پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ اگر دمشق میں ہمارا جی نہ لگا تو ہم واپس آپ کے پاس آجائیں گے۔"

مرقس نے کہا "بہت اچھا، ہم تمہیں مجبور نہیں کر سکتے۔ لیکن مجھے اس بات کا افسوس رہے گا کہ قیصر سے تمہاری ملاقات نہیں ہو سکتی۔"

عاصم نے جواب دیا "قیصر ان دنوں بہت مصروف ہے۔ وہ جنگ سے واپس آیا ہے اور میں اُسے بلاوجہ بے آرام نہیں کرنا چاہتا۔"

کلاڈیوس نے کہا "تم نے یہ خبر سُنی ہے کہ ایران کا نیا حکمران مر چکا ہے۔"

"نہیں، لیکن آپ کو یہ اطلاع کب ملی ہے؟"

"مدائن سے قیصر کا ایلچی آج یہاں پہنچا اور اُس نے یہ خبر سنائی ہے کہ شیرویہ آٹھ ماہ سے زیادہ اپنی اور اپنے رشتہ داروں کی ملامت برداشت نہیں کر سکا۔ میں ایلچی سے مل کر آیا ہوں اور اُس کی باتوں سے میرا اندازہ ہے کہ تمہاری رہائی سے چند دن بعد وہ اس دُنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ اُس کے جانشین نے قیصر کو یہ پیغام بھیجا ہے کہ میں رُوم کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھوں گا۔"

مرقس نے کہا۔ "جب ہم نے پرویز کو اُس کا کھویا ہُوا تخت اور تاج واپس دلایا تھا۔ تو یہ کون کہہ سکتا تھا کہ چند سال بعد اُس کی افواج ہمارے مشرقی مقبوضات کو آگ اور خون کا پیغام دینے کے بعد قسطنطنیہ کے دروازوں تک پہنچ جائیں گی۔ مجھے اب بھی اس بات کا یقین ہے کہ مجوسی زیادہ دیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ پے در پے شکستیں ایران کی فوجی قوت کو تباہ نہیں کر سکیں، ہمیں ایران کی آخری حدود تک اُن کا

تعاقب کرنا چاہیے تھا۔“

عاصم نے کہا۔ میں اپنی قید کے باعث بہت سے حالات سے بے خبر رہا ہوں، تاہم سفر کے دوران میں مجھے راستے کی بستیوں اور شہروں سے جو حالات معلوم ہوئے ہیں، اُن کے پیشِ نظر میں یہ نہیں کہوں گا، کہ ہرقل نے چند اہم فتوحات کے بعد صلح کرنے میں کوئی غلطی کی ہے۔ مجھے یہ بات قدرت کا ایک معجزہ معلوم ہوتی ہے کہ ایرانی لشکر میں پھوٹ پڑ گئی تھی اور پرویز نے نینوا کی شکست کے بعد حوصلہ ہار دیا تھا۔ ورنہ اگر وہ بزدلی کا مظاہرہ نہ کرتا تو رومی لشکر کو دست گرد کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے قدم قدم پر شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا۔ پھر مدائن میں اگر اُسے اپنی منتشر افواج جمع کرنے کے لئے چند ہفتوں کی مہلت مل جاتی تو اُس کا جوابی حملہ یقیناً خطرناک ہوتا۔ لیکن مجھے اپنے بیٹے کے ہاتھوں اُس کا قتل ہو جانا قدرت کا ایک اور معجزہ نظر آتا ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ قدرت کی ان دیکھی اور ان جانی قوتیں پرویز کے خلاف میدان میں اُتر چکی تھیں، اور اُس کی تباہی کا فیصلہ ہو چکا تھا۔“

مرقس نے کہا ”میں کلاڈیوس سے یہ سُن چکا ہوں کہ جب پرویز کا لشکر ایک سیلاب کی طرح مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا تو عرب میں نبوت کے کسی دعویدار نے رومیوں کی فتح کے متعلق پیش گوئی کی تھی اور یہ وہ دَور تھا جب کہ ہم زیادہ سے زیادہ قسطنطنیہ کو بچانے کے متعلق سوچ سکتے تھے۔“

عاصم نے کہا ”میں کئی لوگوں سے اس پیش گوئی کے متعلق سُن چکا ہوں۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ عرب کی زمین جہاں کسی نیکی کے لئے کوئی جگہ نہیں، ایک نبی کے لئے کیسے سازگار ہو سکتی ہے۔“

مرقس نے کہا ”میں کئی خدا رسیدہ لوگوں کی زبانی یہ سُن چکا ہوں کہ ایک نبی کے ظہور کا وقت آ چکا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی سچا نبی عرب میں پیدا ہوا ہے تو اُس کے اثرات صرف وہیں تک محدود نہیں رہیں گے۔ جب کوئی اُس کا پیغام لے کر ہمارے پاس آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ سرِدست ہمیں اُس کے متعلق پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج ہمارے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس شاندار فتح کے بعد ہم کتنا عرصہ امن اور سکون کی زندگی بسر کر سکیں گے۔“

عاصم نے جواب دیا ”آپ بُرا نہ مانیں، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جب تک انسانوں کی تقدیر کسی قیصر یا کسی کسریٰ کے ہاتھ میں رہے گی، انہیں کوئی دیرپا امن نصیب نہیں ہو سکتا ـــــ اس دنیا کی نجات ایک انسان پر دوسرے انسان کی خدائی میں نہیں بلکہ تمام انسانوں کی مساوات میں ہے۔ ورنہ آج کے ظالم کل کے مظلوم اور آج کے مظلوم کل کے ظالم بنتے رہیں گے۔ کل رومی مظلوم تھے، اور آج ایرانی اپنے آپ کو مظلوم سمجھتے ہوں گے۔ کاش قیصر کی فتح ایک انسان کی بجائے کسی ایسے اصول کی فتح ہوتی، جو طاقتور اور کمزور، ادنیٰ اور اعلیٰ، رومی اور ایرانی، سب کے لئے یکساں قابلِ قبول ہو۔ اور سب انسان یہ کہہ سکتے کہ آج دنیا پر کسی شہنشاہ کا نہیں بلکہ ہمارا پرچم بلند ہو رہا ہے۔“

مرقس نے کہا ”لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایسے اصول کا جھنڈا بلند کرنے والوں کو تمام قبیلوں، تمام نسلوں اور تمام بادشاہوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا ـــــ اور اُن کے خلاف جو جنگ لڑی جائے گی، وہ اپنی شدت کے اعتبار سے روم اور ایران کی جنگوں سے کم نہیں ہو گی۔“

عاصم نے جواب دیا ”یہ درست ہے لیکن اگر قدرت کو انسانیت کی بھلائی مقصود ہے تو وہ دنیا بھر کی مخالفت کے باوجود اس اصول کا جھنڈا اٹھانے والوں کے لئے فتح اور نصرت کے دروازے کھول دے گی۔ پھر جس زمین پر اُن کا خون گرے گا، اُس کے سینے سے عدل و مساوات کے چشمے پھوٹیں گے ـــــ یہ لوگ نسلوں اور قوموں کے درمیان منافرت کی دیواریں مسمار کر دیں گے اور جب قوموں اور نسلوں کے درمیان اخوت کے رشتے استوار ہوں گے تو ایسی تمام جنگوں کے امکانات ختم ہو جائیں گے، جو ایک انسان دوسرے انسان، ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ یا ایک قوم دوسری قوم پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے لڑتی ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ قبیلوں کے سردار، اور قوموں کے حکمران جنہیں صرف انسانوں کی تفریق میں اپنی بھلائی نظر آتی ہے، پوری قوت کے ساتھ اس اصول کی مخالفت کریں گے۔ ایران میں کسریٰ، روم میں قیصر اور باقی دنیا میں ہر چھوٹا اور بڑا حکمران اس اصول کے علم برداروں کو اپنا بدترین دشمن خیال کرے گا لیکن اس کے لئے قربانیاں دینا ان لوگوں کا سب سے بڑا فرض ہو گا جو اپنی آیندہ نسلوں کے لئے امن اور آزادی کا سودا کرنا چاہتے ہیں۔“

مرقس نے کہا ”تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ آج دنیا جس نجات دہندہ کی متلاشی اور منتظر ہے وہ بیک

وقت مشرق و مغرب کے تمام حکمرانوں کے خلاف اعلانِ جنگ کرے گا۔"

"ہاں! میرے نزدیک اِس دنیا کی سب سے بڑی احتیاج یہی ہے۔"

مرقس نے کہا "تم کسی اور دنیا کی باتیں کر رہے ہو ۔۔۔ تاہم مجھے اِس بات کا اعتراف ہے کہ اگر خدا کا کوئی بندہ قبیلوں، نسلوں اور قوموں کے جھگڑے مٹا سکتا ہو، تو میں اِس بڑھاپے میں بھی اُس کے جھنڈے تلے جان دینا اپنے لئے باعث سعادت سمجھوں گا ۔۔۔ میں اور مجھ سے پہلے میرے باپ دادا صرف قیصر کی فتح کے لئے جان دینا جانتے تھے، لیکن انسانیت کی فتح کے لئے اگر کوئی دنیا کے سارے بادشاہوں کے تاج نوچ لے تو بھی مجھے اِس بات کا ملال نہیں ہو گا۔ لیکن سچ کہو، تمہیں واقعی کسی نجات دہندہ کا انتظار ہے؟"

عاصم نے جواب دیا "میں اُن کروڑوں انسانوں میں سے ایک ہوں۔ جنہیں ماضی کی تاریکیوں سے نکلنے کے لئے کسی روشنی کی ضرورت ہے۔ کاش مجھے یہ معلوم ہوتا کہ وہ روشنی کب اور کہاں نمودار ہو گی۔ مجھے ایک نجات دہندہ کا انتظار ہے لیکن کاش میں اِس یقین کے ساتھ اُس کا انتظار کر سکتا کہ وہ ضرور آئے گا۔"

مرقس نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ یہاں کوئی خدا کا بندہ تمہاری تسکین کا سامان فراہم نہیں کر سکا لیکن ممکن ہے کہ دمشق پہنچ کر تمہیں کوئی روشنی دکھانے والا مل جائے۔"

تیسرے دن عاصم اور فسطینہ جہاز پر کھڑے تھے، اور بندرگاہ پر مرقس، کلاڈیوس، ولیریس، انطونیہ اور جولیا، سالمن اور شہر کے چند اور معززین ہاتھ کے اشاروں سے انہیں الوداع کہہ رہے تھے جب بندرگاہ اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو فسطینہ نے عاصم کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "عاصم! کیا یہ ممکن ہے کہ ہم کسی دن دمشق سے یروشلم جائیں۔ میں ایک بار پھر وہ راستہ دیکھنا چاہتی ہوں، جس پر میں نے بچپن میں تمہارے ساتھ سفر کیا تھا۔"

"یہ ممکن ہے، لیکن کاش ہم ماضی کے گزرے ہوئے ایام واپس لا سکتے۔"

ہرقل فاتحانہ جاہ و جلال کے ساتھ قسطنطنیہ سے روانہ ہوا۔ اُس کی رعایا اپنے حکمران کے علاوہ اُس صلیب کو دیکھنے کے لئے بیتاب تھی، جسے پرویز یروشلم کی فتح کے بعد اپنے ساتھ لے گیا تھا، اور جسے دوبارہ یروشلم واپس لانا عیسائیوں کے نزدیک ہرقل کی سب سے بڑی نیکی تھی۔ شام کے ساحل تک بحری سفر کے دوران جن بندرگاہوں پر ہرقل کا سفینہ رکتا تھا، وہاں لوگوں کا میلہ لگ جاتا تھا۔ اور وہ جو چند برس قبل اُسے بزدلی اور بے حسی کے طعنے دیا کرتے تھے، اُس کے ہاتھوں کو بوسہ دینا یا دور ہو کر اُس کی قبا کو چھو لینا بھی اپنے لئے باعث سعادت خیال کرتے تھے۔ جب مقدس صلیب لوگوں کے سامنے لائی جاتی تھی تو وہ عقیدت اور محبت کے جذبات سے مغلوب ہو کر دیوانہ وار اُس پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ہر شخص اُسے بوسہ دینے میں دوسروں سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا، پھر جب قیصر اگلی منزل کا رُخ کرتا تھا تو وہ مقامات جہاں تھوڑی دیر کے لئے اس صلیب کی نمائش کی جاتی تھی، عقیدتمندوں کی نگاہوں کا مرکز بن جاتے تھے۔

ہرقل نے بحری سفر ختم کرنے کے بعد خشکی کا راستہ اختیار کیا تو یروشلم تک لاکھوں انسان اُس کے لئے چشم براہ تھے۔ اور ہر منزل پر اُس کے جلوس میں شامل ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ وہ حکمران تھا جس نے انتہائی مایوس کن حالات میں اپنی رعایا کو سہارا دیا تھا اور آج یہ رعایا تشکر کے آنسوؤں سے اپنے محسن کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ صلیب کو اپنی پرانی جگہ نصب کرنے، کلیسا کے اکابر سے دعائیں لینے اور عوام سے عقیدت اور محبت کے نذرانے وصول کرنے کے بعد ہرقل نے جشن عام کا حکم دیا۔

شہر سے باہر اُس کے خیمے اُسی ٹیلے پر نصب تھے، جہاں چند برس قبل خسرو پرویز پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اور عین اُس وقت جبکہ اُس کا یہ احساس اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا کہ آج اِس آسمان کے نیچے مجھ سے بڑا فاتح اور مجھ سے زیادہ طاقتور اور کوئی نہیں۔ اُسے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نامہ مبارک پیش کیا گیا۔ جس کا مضمون یہ تھا:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمدؐ کی طرف سے جو خدا کا بندہ اور رسول ہے۔ یہ خط ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیس اعظم ہے —— اُس کو سلامتی ہو، جو ہدایت کا پیروکار ہے۔ اس کے بعد میں تجھ کو اسلام کی دعوت دیتا ہُوں۔ تم اسلام لاؤ، تو سلامت رہو گے۔ اللہ تمھیں دُگنا اجر دے گا۔ اگر تم نے نہ مانا تو اہلِ ملک کا گناہ تمہارے سر ہو گا۔ اے اہلِ کتاب کسی ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے۔ وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اور ہم میں سے کوئی (اُس کے سوا) کسی کو خدا نہ بنائے۔ اور اگر تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں۔"

ہرقل کے دربار میں اسلام کی آواز اُس آواز سے کہیں زیادہ اجنبی تھی جو چند سال قبل اہلِ مکہ نے سُنی تھی۔ وہ نینوا کے میدان میں اپنے وقت کی سب سے بڑی طاقت کو پامال کر چکا تھا۔ اُس نے بازنطینی سلطنت کو ساسانی قوم کی وحشت اور بربریت سے نجات دلائی تھی۔ اور اُس نے شام، فلسطین، آرمینیا اور ایشیائے

فوٹ:۔ ہرقل کے نام سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا خط حضرت دحیہ کلبی لائے تھے۔ اسلام کے قریباً سارے مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ حضورؐ نے سنہ ۶ھ کے آخر یا سنہ ۷ھ کے شروع میں بیک وقت ایران کے خسرو پرویز، قیصرِ روم، عزیزِ مصر، رئیسانِ یمامہ اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو اسلام کی دعوت دی تھی۔ لیکن واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ پرویز کو حضورؐ کا خط ہرقل کی نسبت کئی مہینے قبل اُن ایام میں ملا تھا جب کہ ابھی اُسے فیصلہ کن شکست نہیں ہُوئی تھی۔ اور ہرقل کے پاس حضورؐ کا خط اتنی تاخیر کے بعد اس لئے پہنچا تھا کہ وہ اپنے دارالحکومت سے سینکڑوں میل دُور ایران کے میدانوں میں پیش قدمی کر رہا تھا۔ حضرت دحیہ کلبی قسطنطنیہ جانے کی بجائے بُصریٰ کے مقام پر جو شام کے غسانی حکمرانوں کا پایۂ تخت تھا رک گئے تھے۔ اور انہوں نے یہ خط حارث غسانی کے سپرد کر دیا تھا جو رومیوں کا باجگزار تھا۔ پھر جب ہرقل فتوحات کے بعد قسطنطنیہ سے ہوتا ہُوا یروشلم پہنچا تو حارث غسانی نے یہ خط اُسے پہنچا دیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کا ایلچی ایک طویل عرصہ بُصریٰ میں قیام کرنے کے بعد ہرقل کی آمد پر بذاتِ خود یروشلم پہنچا ہو۔

بہر حال مورخین اس بات پر متفق ہیں، کہ ہرقل کو حضورؐ کا نامہ مبارک یروشلم میں ملا تھا، اور وہیں اُس نے ابوسفیان کے ساتھ جو ابھی تک مشرکینِ مکہ کے سرکردہ لیڈروں میں تھا، ملاقات کی تھی۔

کوچک میں عیسائیوں کے وہ لاتعداد گرجے دوبارہ کلیسا کو دلوائے تھے، جنہیں مجوسیوں نے آتشکدوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ ان عظیم کامیابیوں کے بعد اُس کی شان و شوکت کا نظارہ دیکھنے والے اِس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ صحرائے عرب سے نبوت کا ایک دعویدار دنیا کے اُس عظیم فرمانروا سے ہمکلام ہونے کی جرأت کرے گا، جس نے انسانی تاریخ کا رُخ بدل دیا تھا۔

لیکن ہرقل، پرویز سے مختلف تھا۔ سرکارِ مدینہ کا خط موصول ہوتے ہی اُس نے حکم دیا کہ اگر عرب کا کوئی باشندہ یہاں موجود ہو تو اُسے ہمارے سامنے پیش کیا جائے، اتفاق سے عرب تاجروں کا ایک قافلہ غزہ میں مقیم تھا۔ اور مکہ سے ابوسفیان اُن کے ساتھ آیا ہُوا تھا —— قیصر کے آدمی انہیں تلاش کر کے یروشلم لے آئے۔ ہرقل نے بڑے ٹھاٹھ سے دربار منعقد کیا اور جب حکومت کے عمال اور کلیسا کے اکابر اُس کے تخت کے گرد جمع ہو گئے تو عرب تاجروں کو حاضر ہونے کا حکم ملا اور پھر جب یہ صحرانشین انتہائی مرعوبیت کے عالم میں ہرقل کا جاہ و جلال دیکھ رہے تھے، اُس نے مترجم کی وساطت سے سوال کیا "تم میں سے نبوت کے مدعی کا رشتہ دار کون ہے؟"

عربوں کی نگاہیں ابوسفیان پر مرکوز ہو کر رہ گئیں اور اُس نے جواب دیا۔ "میں ہوں۔"

قیصر نے پوچھا۔ "اس نبی کا خاندان کیسا ہے؟"

"اُس کا خاندان شریف ہے۔" ابوسفیان نے جواب دیا

"اِس خاندان میں سے کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔"

"نہیں۔"

"اِس خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟"

"نہیں۔"

"جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے، وہ صاحبِ اثر ہیں یا کمزور؟"

ابوسفیان نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔ "یہ کمزور اور بے بس لوگ ہیں۔"

"اُسے ماننے والوں کی تعداد کم ہو رہی ہے یا بڑھ رہی ہے؟"

"بڑھ رہی ہے۔"

"تمہیں ان لوگوں کی نسبت کبھی جھوٹ کا تجربہ ہُوا ہے؟"

"نہیں۔"

"مدعی نبوت نے کبھی اپنے عہدو اقرار کی خلاف ورزی بھی کی ہے؟"

"ابھی تک تو ایسا نہیں ہُوا۔ لیکن اب ہمارے درمیان جو صلح کا معاہدہ ہُوا ہے اُس کے متعلق ابھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کہاں تک اُس کی پابندی کرے گا۔"

"تم نے کبھی اُس کے ساتھ جنگ بھی کی ہے؟"

"ہاں۔"

"پھر اس کا کیا نتیجہ رہا؟"

"کبھی ہم غالب آئے اور کبھی وہ۔"

"وہ کیا سکھاتا ہے؟"

"وہ یہ کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو اور کسی کو اُس کا شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو، پاکدامنی اختیار کرو، سچ بولو اور صلۂ رحم کرو۔"

ہرقل کچھ دیر سر جھکا کر سوچتا رہا، بالآخر اُس نے کہا "تم یہ تسلیم کرتے ہو کہ وہ شریف النسب ہے پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ تم یہ کہتے ہو کہ اس خاندان سے کبھی کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں یہ سمجھتا کہ یہ خاندانی اثرات کا نتیجہ ہے۔ تم یہ مانتے ہو کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ نہ تھا، اگر ایسا ہوتا تو میں یہ سمجھتا کہ اُسے بھی بادشاہت کی خواہش ہے۔ تم یہ بھی تسلیم کرتے ہو کہ اُس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اب جو شخص انسانوں سے جھوٹ نہیں بولتا، وہ خدا پر کیوں کر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ اُس کے پیرو کمزور اور غریب ہیں اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب لوگ ہی ہوتے ہیں۔ تم نے ہمیں بتا دیا ہے کہ اُسے ماننے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اور ہمارے نزدیک یہ بھی اُس کے دین کی سچائی کی علامت ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اُس نے کبھی فریب نہیں کیا پیغمبر یقیناً کبھی فریب

نہیں کرتے۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز، تقویٰ اور عفو کی ہدایت کرتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو میری قیام گاہ تک اُس کا قبضہ ہو جائے گا۔ مجھے اِس بات کا احساس ضرور تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ اگر میں وہاں پہنچ سکتا تو اس کے پاؤں دھوتا۔"

سلطنت کے اکابر، اور کلیسا کے پیشواؤں کی موجودگی میں یہ الفاظ اُس شخص کی زبان سے نکلے تھے، جنہیں وہ دینِ مسیح کا سب سے بڑا حامی و ناصر سمجھتے تھے۔ پھر انہوں نے ایک ایسے عرب کی زبانی اُس کی تعریف سنی تھی جو اب تک اسلام دشمنی میں پیش پیش تھا۔ اُن کے سینوں میں غصے کی آگ سلگ رہی تھی لیکن قیصر کے احترام کے باعث اُن کی زبانیں گنگ ہو چکی تھیں۔ لیکن جب ہرقل کے حکم سے بھرے دربار میں یہ خط پڑھ کر سنایا گیا تو اُن کی قوّتِ برداشت جواب دے گئی۔ خاموش نگاہوں کا احتجاج زبانوں پر آگیا اور پادریوں اور راہبوں کی دبی ہوئی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ روم کے شہنشاہ نے ہدایت کے جس نور کو اپنے سینے میں جگہ دینے کی جسارت کی تھی، اُس کے راستے میں دنیاوی جاہ و حشمت اور تخت و تاج کی محبت کے پردے حائل ہوگئے۔ وہ ہاتھ جو اچانک حسین پھولوں کی طرف بڑھے تھے، کانٹوں کے خوف سے پیچھے ہٹ گئے، اور وہ ہمت جو کبھی ہرقل کو مایوسی کے دلدل سے نکال کر نینوا اور دست گرد کے میدانوں کی طرف لے گئی تھی، اچانک جواب دے گئی۔ ہرقل نے اپنی رعایا کا اضطراب دُور کرنے کے لئے عربوں کو دربار سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اور کلیسا کی عظمت اور تقدیس کے محافظ اُسے مبارک باد دینے لگے۔ وہ خوش تھے وہ اس بات پر خوش تھے کہ انہوں نے ایک پیاسے مسافر کو ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے کی طرف بھاگنے سے روک لیا ہے لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ عرب کے صحرا سے جو چشمہ پھوٹا ہے اُس سے کئی دریا اور کئی ندیاں نکلیں گی اور ان دریاؤں اور ندیوں کے سیلاب کی لہریں ایک طرف عیسائیت اور دوسری طرف مجوسیت کے سارے بند توڑ ڈالیں گی۔ وہ قیصر کو ہاتھ پھیلانے سے منع کر سکتے ہیں لیکن رحمت کی اُس گھٹا کو برسنے سے روک نہیں سکتے جس کے بادل عرب کے آسمان پر جمع ہو رہے تھے۔

باب ۴۲

دمشق میں عاصم کی حالت اس مسافر کی سی تھی جو مدتوں وحشت ناک صحراؤں میں بھٹکنے کے بعد ایک نخلستان کی ٹھنڈی چھاؤں میں آرام کر رہا ہو۔ فسطینہ دمشق کے حاکم کو شاہی فرمان دکھانے کے بعد اپنے نانا کی جائیداد حاصل کر چکی تھی۔ پھر اس کے پاس یوں بھی دولت کی کمی نہ تھی۔ چند بیش قیمت ہیرے ان کی عمر بھر کی ضروریات کے لیے کافی تھے۔ عاصم مہرداد کے عطا کردہ سونے سے تجارت شروع کرنا چاہتا تھا۔ لیکن فسطینہ کو اپنے شوہر سے ایک لمحہ کی جدائی بھی ناگوار محسوس ہوتی تھی چنانچہ عاصم شہر سے باہر ایک باغ اور چند کھیت خرید کر مطمئن ہو گیا۔

شادی سے اگلے سال ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اور والدین نے اس کے لیے یونس کا نام پسند کیا۔

عاصم کے دل میں غریب الوطنی کا احساس بتدریج ختم ہو رہا تھا اور ماضی کے آلام و مصائب اب اسے ایک خواب محسوس ہونے لگے تھے۔ دمشق کے حکام اور رؤسا اسے ایک ایسی قابل عزت خاتون کے شوہر کی حیثیت سے جانتے تھے۔ جس کا باپ ایران کی فوج کا ایک جرنیل اور کسریٰ کا دوست ہونے کے باوجود روم کو مکمل تباہی سے بچانے کے لیے اپنی جان دے چکا تھا اور اس نسبت سے دمشق کے انتہائی متعصب پادری اور راہب بھی اگر دل سے نہیں تو ظاہری طور پر اس کی عزت ضرور کرتے تھے۔ مذہب کے متعلق شوہر اور بیوی کے جذبات ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ فسطینہ کو بڑی شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ ایران کے ایک نامور جرنیل کی حیثیت سے اس کے باپ نے جو فتوحات حاصل کی تھیں وہ خدا کو پسند نہ تھیں۔ اور ان پر خوش ہونا یا فخر کرنا ایک گناہ تھا۔ اور اس کے لیے بہترین کفارہ یہی ہو سکتا تھا

کہ وہ دنیا سے منہ موڑ کر ایک راہب کی زندگی اختیار کر لیتی۔ لیکن عاصم نے اُسے لرزتے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے زندگی کا دامن پکڑنے پر مجبور کر دیا۔ تاہم اس کی مسرت کا کوئی لمحہ بھی اس قسم کے خدشات سے خالی نہ تھا۔ خدا کی ناراضگی اسے کسی وقت بھی نئے آلام و مصائب میں مبتلا کر سکتی ہے۔ چنانچہ وہ رو رو کر اپنے شوہر اور کمسن بچے کی سلامتی کے لیے دعائیں کیا کرتی تھی۔ وہ گرجوں اور خانقاہوں میں جاتی اور ان خدارسیدہ بزرگوں کو خوش کرنے کے لیے بڑے بڑے نذرانے پیش کرتی جن کے متعلق یہ مشہور تھا کہ ان کی دعائیں آنے والی مصیبتیں ٹال سکتی ہیں۔

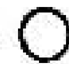
وہ عاصم کو بھی عیسائیت پر ایمان لانے کی ترغیب دیا کرتی تھی۔ اور وہ اسے خوش کرنے کے لیے کبھی کبھی اس کے ساتھ گرجوں اور خانقاہوں میں بھی چلا جاتا تھا۔ تاہم عیسائیت کے متعلق اس کے جذبات بہت سرد تھے۔ اور یہ سرد مہری یا بے توجہی کسی ضد یا ہٹ دھرمی کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ اس کی وجہ اس تلخ حقیقت کا اعتراف تھا کہ عرب کی اصنام پرستی اور ایران کی مجوسیت کی طرح اسے کلیسا کا دامن بھی اس روشنی سے خالی نظر آتا تھا جو انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلوں کو سلامتی کی راہ دکھا سکتی۔ وہ ایک ایسے دین کا متمنی تھا جو قوموں اور نسلوں کو عدل و انصاف اور امن کا راستہ دکھا سکے۔ لیکن ایسے دین کا کوئی واضح تصور اس کی عقل اور سمجھ سے بالاتر تھا۔ اور پھر وہ دنیا جسے اس نے اپنی نگاہ سے دیکھا تھا ایسے اسباب سے بھی خالی نظر آتی تھی جو توہمات جہالت اور تعصب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں پر ایسے دین کے نفاذ کے لیے ضروری تھے۔ کبھی دمشق کے بازاروں میں عرب کے کسی قبیلے کے تاجر مل جاتے تو وہ انہیں اپنے گھر لے جاتا۔ ان کی تواضع کرنے کے بعد اپنے وطن کے حالات پوچھتا۔ اور جب وہ یہ سنتا کہ چند بے سروسامان انسانوں کا جو قافلہ مکہ سے نکل کر یثرب پہنچا تھا، ان کے عزم و استقلال نے پورے عرب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ تو اسے حیرت ہوتی۔ بدر کے میدان میں مٹھی بھر مسلمانوں کے ہاتھوں قریش مکہ کی شکست اُسے ناقابل یقین محسوس ہوتی تھی۔ لیکن اس کے بعد جب فرزندانِ توحید کی مزید فتوحات کی خبریں آنے لگیں تو اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ عرب میں واقعی کوئی غیر متوقع انقلاب آ چکا ہے۔ اسلام کی تعلیم کے متعلق سنی سنائی باتوں سے اُسے ایک تسکین

محسوس ہوتی تھی۔ تاہم وہ یہ جاننے کے لیے تیار نہ تھا کہ غلاموں اور شہنشاہوں کی دنیا کی کایا پلٹ کرنے کے لیے جس عظیم قوت کی ضرورت ہے وہ عرب سے نمودار ہو سکتی ہے۔

کلاڈیوس جو ہرقل کی محافظ فوج کے ساتھ یروشلم پہنچا تھا۔ واپس جانے کی بجائے وہاں کے رومی لشکر کی کمان سنبھال چکا تھا۔ اور چند ماہ بعد انطونیہ بھی وہاں پہنچ چکی تھی۔

سرحد کے آس پاس غسانی رؤسا اپنے رومی سرپرستوں کو عرب کے حالات سے باخبر رکھتے تھے چنانچہ یروشلم سے کلاڈیوس عاصم کے نام جو خطوط بھیجا کرتا تھا، وہ اس ناقابلِ یقین انقلاب کی تصدیق کرتے تھے جو عرب کے اندر رونما ہو رہا تھا۔ عرب میں توحید کے پرستاروں اور عدل و انصاف کا جھنڈا بلند کرنے والوں کے آلام و مصائب عاصم کے نزدیک خلافِ توقع نہ تھے۔ وہ پیغمبرِ اسلامؐ اور ان کے جان نثاروں کی ہجرت کے اسباب سمجھ سکتا تھا۔ لیکن اسلام کے جھنڈے تلے اوس اور خزرج اور یثرب کے دوسرے خاندانوں کا متحد ہو جانا اور پھر بے سروسامان انسانوں کی ایک قلیل تعداد کا اہلِ مکہ کو شکست دینا اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

عرب تاجروں کی زبانی بدر، احد، اور خندق کی جنگوں کے واقعات سننے کے بعد وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ اہلِ مکہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک کہ یثرب کی وادی کا ایک ایک گھر راکھ کا انبار نہیں بن جاتا۔ حدیبیہ کی صلح اور اس کے ساتھ ہی مشرق و مغرب کے تاجداروں کے نام پیغمبر اسلامؐ کے خطوط کی حیثیت اس کے نزدیک ایک مذاق سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن عرب تاجروں کی باتوں اور کلاڈیوس کے خطوط سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ معاملہ اب مذاق کی حد سے آگے گزر چکا ہے



یونس کی پیدائش کے چوتھے سال جب عاصم نے یہ خبر سنی کہ مسلمانوں نے بلقا کے غسانی رئیس سے اپنے نبیؐ کے ایک ایلچی کے قتل کا قصاص لینے کے لیے موتہ پر حملہ کر دیا ہے تو اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ——— پھر چند ماہ بعد اُسے کلاڈیوس کی طرف سے ایک طویل خط ملا جس کا مضمون یہ تھا:

”میرے دوست! گذشتہ چند ماہ سے میری مصروفیات کچھ ایسی تھیں کہ میں تمہیں خط نہ لکھ سکا۔ میں سرحدی چوکیوں کے معائنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ اور وہاں کچھ ایسے حالات پیدا ہو رہے تھے کہ مجھے ہفتوں کی بجائے مہینوں یروشلم سے باہر رہنا پڑا۔ تم موتہ پر مسلمانوں کی غیر متوقع پیش قدمی کے واقعات سن چکے ہو گے غالباً یہ تاریخ کا پہلا واقعہ ہے کہ صحرائے عرب کے تین ہزار بے سروسامان آدمی ایک ایلچی کا قصاص لینے کے لیے دنیا کی عظیم ترین سلطنت سے الجھنے کی جرأت کرتے ہیں۔ بلقا کا غسانی رئیس ہمارا باجگزار ہے۔ اور مسلمانوں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ تھی کہ اس کے علاقے پر حملہ رومی سلطنت کے خلاف اعلانِ جنگ تصور کیا جائے گا۔ غسانی قبائل کے پاس ایک لاکھ کے لگ بھگ تربیت یافتہ جنگجو موجود تھے اور پھر ہماری افواج جو پورے شام میں پھیلی ہوئی ہیں ان کی پشت پر تھیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود، یہ لوگ مرعوب نہیں ہوئے۔

ایک لشکر کسی فتح کی امید پر چڑھائی کرتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے طرزِ عمل سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ فتح اور شکست سے بے نیاز ہو کر میدان میں آتے ہیں۔ ان کی شکست یقینی تھی۔ لیکن میں اس جنگ میں حصہ لینے والے جن لوگوں سے ملا ہوں۔ وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے جرأت اور شجاعت کا اس سے بڑا مظاہرہ نہیں دیکھا غسانی صرف اس بات پر فخر کر سکتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو آگے نہیں بڑھنے دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پیچھے ہٹنے سے پہلے وہ غسانی لشکر کو اس قدر مرعوب کر چکے تھے کہ کسی کو ان کا تعاقب کرنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ مجھے تین ہزار مسلمانوں کے مقابلے میں ایک لاکھ آدمیوں کی اس کامیابی کو فتح کہتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ صرف ابتدا تھی۔ اب یہ مسلمان کئی میدانوں میں عرب قبائل کی اجتماعی قوت کو شکست دے چکے ہیں۔ انہوں نے مکہ جسے عرب کا مرکز خیال کیا جاتا ہے فتح کر لیا ہے۔ انہوں نے

قبائل کے درمیان منافرت کی آہنی دیواریں توڑ دی ہیں۔ تم کہا کرتے تھے کہ ایک عرب اپنے قبیلے کے خلاف تلوار نہیں اٹھاتا۔ لیکن میں عرب کے کئی تاجروں سے مل چکا ہوں۔ اور وہ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ مسلمان اپنے دین کے دشمنوں کے خلاف لڑتے وقت اپنے خون کے رشتوں سے بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ تم کہتے تھے کہ مقتول کا انتقام لینا عرب کے باشندوں کا جزوِ ایمان ہے۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ کل تک جو قبائل مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے وہ آج اپنی شکستیں بھول کر ان کے دوش بدوش لڑ رہے ہیں —— میرے دوست! عرب میں کوئی ایسا انقلاب آچکا ہے جو میری، تمہاری اور شاید دنیا کے تمام انسانوں کی سمجھ سے بالاتر ہے

تم کہا کرتے تھے کہ اس وقت عرب میں یہودیوں سے زیادہ منظم اور متحد اور کوئی طاقت نہیں۔ اور ان کا سب سے بڑا مرکز خیبر ہے۔ لیکن میں ان یہودیوں سے مل چکا ہوں جو خیبر میں شکست کھانے کے بعد شام کی حدود میں پناہ لے چکے ہیں۔ اور انہیں اس بات کا اعتراف ہے کہ عرب میں ایک دین کے ساتھ ایک عظیم فوجی قوت کا ظہور ہو رہا ہے۔ محمد (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمْ) کے پیرو جب انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے تو بھی وہ عرب کے اندر اور عرب سے باہر کسی طاقت سے مرعوب نہیں تھے اور جب انہیں مٹانے کے لیے عرب قبائل متحد اور منظم ہو رہے تھے تو ان کے ہادی کی خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ وہ مشرق و مغرب کے حکمرانوں کو ایک ایسا دین قبول کرنے کی دعوت دے رہا تھا جس کی تعلیم اس دنیا سے بندہ و آقا کا امتیاز مٹانا چاہتی ہے:

یہ نیا دین جو دنیا کے تمام قبیلوں اور نسلوں کے درمیان اخوت اور مساوات کے رشتے قائم کرنا چاہتا ہے۔ صرف عرب کی قبائلی عصبیتوں کے خلاف ہی نہیں بلکہ ہر اس معاشرے کے خلاف ایک اعلانِ جنگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو طاقت ور کو کمزور، امیر کو غریب اور اعلیٰ کو ادنیٰ پر آقائی کا حق دیتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ آج اگر ہمارا قیصر بھی یہ اعلان

کر دے کہ ایک رومی، ایک شامی یا مصری پر برتری کا دعوےٰ نہیں کر سکتا۔ یا خدا کے سامنے میرا اور میری رعایا کے ہر فرد کا درجہ برابر ہے۔ تو سلطنت کے امراء اور کلیسا کے پیشوا یکساں جوش و خروش کے ساتھ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اور میرے خیال میں اس دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں کسی حکومت کے ایوانوں یا کسی مذہب کی عبادت گاہوں میں انسانی مساوات کے لیے جگہ ہو —— میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دین کو پوری دنیا کے خلاف اعلانِ جنگ سمجھتا ہوں اور میرے دل میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عرب کی سرزمین کسی ایسی عظیم قوت کو جنم دے سکے گی جو اس عظیم جنگ سے عہدہ برآ ہو سکے؟ تم عرب کے مستقبل سے مایوس ہو کر نکلے تھے اور میں بھی اس بے آب و گیاہ زمین کے مستقبل کے ساتھ کوئی بلند توقعات وابستہ نہیں کر سکتا۔ لیکن تم حیران ہو گے کہ جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے ہیں، میں ان کے بدترین دشمنوں سے مل چکا ہوں اور وہ سب اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ دنیا کی کوئی مصیبت یا آزمائش اپنے ہادی کی صداقت پر ان کا یقین متزلزل نہیں کر سکتی پچھلے دنوں ایک تاجر سے جو مکہ اور مدینہ کے راستے یروشلم پہنچا تھا، میری ملاقات ہوئی تھی۔ اور وہ یہ کہتا تھا کہ اگر یہ لوگ آسمان کے تارے نوچ لیں تو بھی مجھے تعجب نہیں ہوگا۔

—— اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس دنیا کو اخوت اور مساوات کا درس دینا آسمان کے تارے نوچنے سے آسان نہیں۔

عاصم! تم حیران ہو گے کہ موتہ کی جنگ کے بعد ہم کافی سنجیدگی کے ساتھ اپنی مشرقی سرحدوں کی طرف مسلمانوں کی پیش قدمی کا خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔ میں قریباً چار مہینے غسانی رؤسا کے قلعوں اور چوکیوں کا معائنہ کرنے کے بعد یروشلم واپس آیا ہوں۔ وہاں یہودیوں نے اس قسم کی افواہیں پھیلا رکھی ہیں کہ مسلمان حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ لیکن مجھے یہ بات ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہے۔ موتہ کی جنگ کے بعد

انہیں ہماری قوت کا تھوڑا بہت اندازہ ضرور ہو گیا ہو گا ــــــ اور اس کے بعد اگر انہوں نے شام کا رخ کرنے کی جسارت کی تو مجھے اندیشہ ہے کہ ہم ان ریگ زاروں تک ان کا تعاقب کرنے پر مجبور ہو جائیں گے جہاں ببول کے کانٹوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا ــــ کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کاش میں اس نبی کو قریب سے دیکھ سکتا۔

قیصر کو اس نئے دین کے حامیوں کے ساتھ الجھنا پسند نہیں۔ لیکن سلطنت اور کلیسا کے اکابر یہ خدشہ محسوس کرتے ہیں کہ جو قوت عرب قبائل کے اندر اتحاد اور مرکزیت پیدا کر سکتی ہے وہ آگے چل کر عرب کے ہمسایہ ممالک پر رومیوں کے اقتدار کے لیے خطرناک ثابت ہو گی۔ شام، ایشیائے کوچک اور مصر کے ممالک میں ہم ہر اس تحریک کی مخالفت کریں گے جو وہاں کے عوام میں رومی حکومت کے خلاف بغاوت کے جذبات بیدار کر سکتی ہو۔ اور اس مقصد کے لیے اگر ہمیں عرب پر چڑھائی کرنی پڑی تو بھی ہم اس سے دریغ نہیں کریں گے۔ روم اور ایران کی جنگ کی ہولناکیاں مجھے کسی نئی جنگ سے متنفر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن امن کا طلب گار ہونے کے باوجود میں ایک سپاہی ہوں اور اس دنیا میں اسباب و نتائج کے متعلق صرف ایک سپاہی کے ذہن سے سوچ سکتا ہوں۔ اور عرب کے نبی کے متعلق سنی سنائی باتوں سے متاثر ہونے کے باوجود مجھے وہ اسباب نظر نہیں آتے جو رومی سلطنت کی عظیم قوت کے ساتھ متصادم ہونے کے بعد اس کے ماننے والوں کے لیے ایک عبرتناک شکست یا مکمل تباہی کے سوا کوئی اور نتیجہ پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر اس دین کے علمبرداروں کی نگاہیں صرف عرب پر مرکوز رہتیں تو ممکن تھا کہ وہ کسی دن جہالت کی دلدل سے نکل کر ایک متمدن قوم بن جاتے۔ لیکن انہوں نے ابتدا میں ہی مشرق و مغرب کے حکمرانوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ امن اور عدل آج انسانیت کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور یہ ضرورت انسانوں کے درمیان اخوت اور مساوات

کے رشتے قائم کیے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔ لیکن روم و ایران کے شہنشاہوں اور دوسرے چھوٹے اور بڑے حکمرانوں کو ایسے امن کی ضرورت نہیں جس کی اولین شرط آقا اور غلام کا امتیاز مٹانا ہے۔

ان دنوں میرے دل میں بار بار صرف ایک ہی سوال آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ کونسی طاقت ہے جس کے بل بوتے پر عرب کے نبی (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) نے ایران اور روم کے فرمانرواؤں کو اپنے دین کی دعوت دینے کی جسارت کی ہے؟ اور وہ کونسی قوت ہے جس کی بدولت اس کے پیرو کسی کامیابی یا فتح کی امید رکھتے ہیں؟ اور میں جس قدر سوچتا ہوں اسی قدر مجھے الجھن محسوس ہوتی ہے اور میری الجھن کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میں یروشلم میں کئی ایسے خدارسیدہ آدمیوں سے مل چکا ہوں جو فریس کی طرح کسی نبی کے منتظر ہیں۔

میں اب تک عرب کے کئی تاجروں سے اس نبیؐ کے متعلق پوچھ چکا ہوں اور ان میں سے چند ایسے بھی تھے جو مکہ کے رہنے والے تھے۔ اور وہ سب اس بات کی تصدیق کرتے تھے کہ جب ایرانیوں کی فتوحات کا سیلاب بحیرہ روم کے کناروں تک پہنچ چکا تھا اور ہمارے دوبارہ اٹھنے اور سنبھلنے کی تمام امیدیں معدوم ہو چکی تھیں۔ تو اس نبیؐ نے پورے وثوق کے ساتھ یہ اعلان کیا تھا کہ یہ جنگ بالآخر رومیوں کی فتح پر ختم ہو گی۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ خدا نے اپنے کسی بندے کو آنے والے حالات سے آگاہ کر دیا ہو اور میں یہ بھی تسلیم کر سکتا ہوں کہ عربوں کی کایا پلٹ کے لیے قدرت کی ان دیکھی اور ان جانی قوتیں اس نبی کی رہنمائی کر رہی ہیں لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ قدرت کا کوئی معجزہ ان صحرا نشینوں کو ہمارے مقابلے میں کھڑا کر سکتا ہے۔ ہم گئی گزری حالت میں بھی ایرانیوں کے بعد دنیا کی دوسری عظیم قوت تھے اور اپنی بدترین شکستوں کے دور میں بھی یہ امید ہمارا آخری سہارا

تھی کہ شاید حالات بدل جائیں۔ اور ہمارا مایوس اور بددل حکمران کسی دن اپنے زخمی ہاتھوں سے اپنے گرے ہوئے پرچم کو اٹھالے۔ لیکن عرب اور روم کی طاقت میں اتنا فرق ہے کہ اگر روئے زمین کے تمام خدارسیدہ لوگ یک زبان ہو کر یہ پیش گوئی کریں کہ ہماری سلطنت کو اہلِ عرب سے کوئی بڑا خطرہ پیش آسکتا ہے تو بھی مجھے یقین نہیں آئے گا۔ اور مسلمانوں کے نبیؐ کے عزائم یہ ہیں کہ اس نے قیصر کے علاوہ کئی اور حکمرانوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے اور اُسے ماننے والوں کو اس بات کا یقین ہے کہ دنیا کی کوئی سلطنت ان کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔

عاصم! مجھے یقین ہے کہ جس سیلاب کی لہر موتہ تک پہنچ گئی تھی وہ دوبارہ شام کی سرحدوں کا رخ نہیں کرے گا۔ تاہم کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ کا یہ دور ناقابلِ یقین واقعات کا دور ہے۔ کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر میں تمہاری طرح ایک عرب ہوتا تو موت سے پہلے اس نبی کو دیکھنے کی کوشش ضرور کرتا جس کی تعلیم دنیا کے تمام حکمرانوں کے خلاف اعلانِ جنگ کے مترادف ہے اور جسے ماننے والے مٹھی بھر انسان اپنی فتح پر یقین رکھتے ہیں اور پھر اگر مجھے اس میں کوئی صداقت نظر آتی تو میں واپس آکر اپنے رومی دوستوں کے سامنے یہ اعلان کرتا کہ اس نے میری نگاہوں سے مستقبل کے سارے پردے اٹھا دیئے ہیں۔ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ مغرب اور مشرق کے انسانوں کو صرف اسی کے دامنِ رحمت میں پناہ مل سکتی ہے اور جب اس کا قافلہ عرب کی حدود سے باہر نکلے گا تو تمہاری تلواریں اس کا راستہ نہیں روک سکیں گی۔

میرے دوست! قیصر کا ایک جان نثار ہونے ، اور صبح و شام بازنطینی سلطنت کی سلامتی کی دعائیں مانگنے کے باوجود کبھی کبھی مجھے اپنے دل میں یہ خلش محسوس ہوتی ہے کہ اگر وہ سچا ہے، اگر یہ وہی ہے جس کا اس دنیا کو انتظار رہے تو

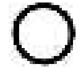
کیا میں اپنے ضمیر کو ہلاک کیے بغیر اس کے خلاف تلوار اٹھا سکوں گا؟

یہاں میری عقل جواب دے جاتی ہے اور پھر میں اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دینے کی کوشش کرتا ہوں کہ کلاڈیوس تم ایک رومی ہو۔ تم قیصر کے سپاہی ہو اور تمہارا کام صرف بازنطینی سلطنت کی سرحدوں کی حفاظت ہے اور پھر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے دماغ کا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے۔ اگر تم میرے پاس ہوتے تو شاید میں اس امید پر تمہیں یثرب کا سفر کرنے پر مجبور کرتا کہ تم واپس آکر مجھے ان لوگوں کے صحیح حالات بتا سکو گے کہ جن کے متعلق سوچتے ہوئے مجھے اضطراب، الجھن اور پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یروشلم کی طرح دمشق میں بھی عرب تاجر آتے ہوں گے۔ کیا ان کی باتیں سن کر تمہارے دل میں کسی دن وہاں جانے کا خیال پیدا نہیں ہوا —— ؟

اور میں یہ سوال اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اگر ہمیں کسی دن عرب کے حالات کے متعلق پوری واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس مقصد کے لیے میرے نزدیک تم سے زیادہ قابلِ اعتماد اور کوئی نہیں ہو گا۔

تمہارا دوست

کلاڈیوس



فسطینہ سے کلاڈیوس کے خط کا مضمون سننے کے بعد عاصم کچھ دیر بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اچانک یونس بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے عاصم کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن جب عاصم نے اس کی طرف توجہ نہ دی تو وہ پریشان سا ہو کر ماں کی طرف بڑھا۔ اور اس کی گود میں بیٹھ گیا۔

فسطینہ نے مغموم لہجے میں سوال کیا۔ ”آپ کیا سوچ رہے ہیں؟“

"کچھ نہیں۔" عاصم نے بے توجہی سے جواب دیا۔

فسطینہ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کروں گی۔"

عاصم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کون سا راستہ؟"

فسطینہ نے جواب دیا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ اپنا وطن دیکھنا چاہیں۔ اور مجھے اس بات کا اطمینان ہو کہ آپ کو وہاں جانے میں کوئی خطرہ نہیں تو میں چند دنوں یا چند ہفتوں کی جدائی برداشت کر سکوں گی۔"

"اس دنیا میں تمہارے گھر کے سوا میرا کوئی وطن نہیں۔" عاصم نے یہ کہہ کر یونس کی طرف ہاتھ پھیلا دیئے اور وہ ماں کی گود سے اتر کر اس کی گود میں آ بیٹھا اور فسطینہ کے مغموم چہرے پر مسکراہٹیں کھیلنے لگیں۔

عاصم نے کہا۔ "فسطینہ! اب میں تمہاری مسکراہٹوں اور یونس کے قہقہوں سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتا۔ لیکن کاش خدا کا کوئی بندہ بادشاہوں اور غلاموں کی اس دنیا میں مجھے تمہارے لیے دائمی راحتیں اور مسرتیں حاصل کرنے کا طریقہ سمجھا سکتا۔ کاش میں تمہارے لیے کوئی ایسا نخلستان تلاش کر سکتا جس کی بہاروں کو خزاں کا خوف نہ ہو۔ مجھے عرب سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن اگر مجھے اس بات کا یقین ہو جائے کہ اس نئے دین کی فتح کے انعامات پوری انسانیت کے لیے یکساں ہوں گے اور جس روشنی میں اوس اور خزرج سلامتی کا راستہ دیکھ چکے ہیں وہ کسی دن یہاں بھی پہنچ سکتی ہے۔ اور یہ گھر، یہ شہر اور یہ ملک زمانے کی ان آندھیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے جس کی ہولناکیوں سے ہمارا ماضی لبریز ہے تو میں سمجھوں گا کہ اس نبی کی اطاعت اور اس کے دین کی اعانت میری زندگی کا پہلا اور آخری فرض ہے۔ اور پھر اگر میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا تو میرے لیے تمہیں بھی یہ اطمینان دلانا مشکل نہیں ہوگا کہ میں ایک انسان، ایک شوہر اور ایک باپ کا فرض پورا کر رہا ہوں۔ اور میری ذاتی خواہش اس سے زیادہ نہیں کہ مرتے وقت مجھے یہ اطمینان ہو کہ میرے بیٹے کی دنیا میری دنیا سے بہتر ہوگی۔"

فسطینہ نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "آپ یہ کیوں سوچتے ہیں کہ جب آپ اچھائی کی تلاش میں نکلیں گے

تو ہم آپ کے ساتھ نہیں ہوں گے۔"

یونس جو پریشان سا ہو کر اپنے والدین کی باتیں سن رہا تھا صرف اتنا سمجھ سکا۔ کہ اس کا باپ کہیں جانے کا ارادہ کر رہا ہے اس نے مضطرب سا ہو کر کہا۔ "ابا جان! میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔"

عاصم نے اُسے اپنے سینے کے ساتھ چمٹا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹا میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ اور اس کے بعد وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے ذہن سے ایک بوجھ اتر چکا ہے۔ اگلے دن وہ کلاڈیوس کے خط کا جواب لکھوا رہا تھا اور اس جواب میں اس نے صرف یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ میری بیوی اور بیٹا خوش ہیں۔ اور اب مجھے یہ جاننے کی خواہش نہیں کہ میرے گھر کی چار دیواری سے باہر کیا ہو رہا ہے اس نے یونس کی معصوم شرارتوں اور بھولی باتوں کا ذکر کیا تھا۔ اس نے انطونیہ اور اس کے بچوں کے حالات دریافت کیے تھے۔ اس نے کلاڈیوس کو دمشق آنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن جہاں تک عرب کے حالات کا تعلق تھا۔ اس نے صرف یہ لکھ کر بات ختم کر دی تھی کہ اب میرے دل میں کسی اور منزل کی طرف دیکھنے کی خواہش باقی نہیں رہی۔ تاہم فسطینہ سے خط لکھواتے ہوئے بھی وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ ظاہری اطمینان آسودگی اور قناعت کے باوجود اپنے ماضی کے ساتھ اس کے سارے رشتے منقطع نہیں ہوئے۔ اور ابھی تک اس کے دل میں اپنے وطن کے ناقابلِ یقین انقلاب کے متعلق مزید سننے اور جاننے کی خواہش کروٹیں لے رہی ہے۔

اور پھر اس کے بعد آئے دن وادیٔ یثرب سے جو اطلاعات موصول ہو رہی تھیں وہ ایسی تھیں کہ عاصم وطن کے حالات اور واقعات سے بیگانہ یا بے تعلق رہ سکتا۔ عرب سے جو تاجر دمشق آتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ اسلام کی تازہ فتوحات اور نئی کامرانیوں کی خبریں لاتے تھے۔ شام کے شہروں میں عرب کی کایا پلٹ قبائل کے اتحاد اور اسلام کی روز افزوں قوت کے ناقابلِ یقین قصے سنانے میں وہ یہودی پیش پیش تھے جو اپنے جرائم کی پاداش میں وہاں سے نکالے گئے تھے۔ اور جن کے نزدیک مسلمانوں سے انتقام لینے کی یہی ایک صورت باقی رہ گئی تھی کہ رومی ان کے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ شام کے رومی حاکموں کو مسلمانوں کے خلاف اکسانے کے لیے وہ غسانی رؤسا بھی یکساں بے تاب تھے

جنہیں اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کا خطرہ اپنی سرحدوں سے زیادہ قریب دکھائی دیتا تھا۔ یہ لوگ عیسائی تھے اور ان کے مذہبی پیشوا اپنے رومی سرپرستوں کو بلا تاخیر صحرائے عرب پر چڑھ دوڑنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ فسطینہ آئے دن دمشق کے گرجوں اور خانقاہوں سے واپس آکر اپنے شوہر کو ناقابلِ یقین خبریں سناتی۔ عاصم بظاہر ان خبروں کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کرتا، لیکن اپنے دل کی گہرائیوں میں وہ ہمیشہ یہ محسوس کرتا تھا۔ کہ یہ سب باتیں غلط نہیں ہو سکتیں۔ مدینہ اور خیبر سے نکلے ہوئے یہودی رومی اور شامی عیسائیوں کو مشتعل کرنے کے لیے غلط بیانی سے کام لے سکتے ہیں۔ لیکن وہ عرب جو جانکنی کے عالم میں بھی اپنی شکست کا اعتراف نہیں کرتے، بلا وجہ اپنے حریف کی طاقت اور عظمت کا اعتراف نہیں کر سکتے۔

ایک دن دمشق کے ایک چوراہے میں لوگوں کا ہجوم یمن کے ایک تاجر کی زبانی یہ خبر سن رہا تھا کہ مسلمانوں نے مکہ فتح کر لیا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے پیغمبرِ اسلام کا جاہ و جلال دیکھا ہے۔ میں نے وہاں اپنے کانوں سے اللہ اکبر کی اذانیں سنی ہیں۔ وہ بت جو کعبے کے اندر نصب تھے توڑ دیے گئے ہیں۔ قریش کے سرداروں کا غرور خاک میں مل چکا ہے۔ اب عرب کے اندر کوئی ایسی قوت باقی نہیں رہی جو اسلام کا راستہ روک سکے۔ جب ہم مکہ سے روانہ ہوئے تھے۔ تو مسلمانوں کا لشکر اوطاس کی طرف کوچ کر چکا تھا۔ مدینہ پہنچ کر ہمیں یہ اطلاع ملی کہ قریش کی طرح ہوازن اور ثقیف قبائل کا غرور بھی خاک میں مل چکا ہے۔ یہ معمولی واقعات نہیں۔ جب میں نے یمن میں یہ خبر سنی تھی کہ مسلمانوں کا ایک لشکر بلقا تک پہنچ کر واپس آگیا ہے تو میں اسے ایک مذاق سمجھتا تھا۔ لیکن اب مجھے کوئی بات ناقابلِ یقین محسوس نہیں ہوتی۔ اب اگر میں یہ سنوں کہ وہ دمشق کا رخ کر رہے ہیں تو بھی مجھے یقین آجائے گا۔

ایک شامی نے غضب ناک ہو کر تاجر کا گلا دبوچ لیا۔ اور بلند آواز میں چلایا۔ "تم بکتے ہو——تم جھوٹ کہتے ہو——تم ہمارے دشمن کے جاسوس ہو——"

عاصم ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے شامی کو دھکا دے کر ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ "دشمن کے جاسوس چوراہوں میں کھڑے ہو کر تقریریں نہیں کرتے۔"

تاجر ہجوم کے تیور دیکھ کر سہم گیا۔ اور اس نے کہا۔ "بھائیو! میں مسلمان نہیں ہوں۔ میرا مقصد تم لوگوں کو خبردار کرنا تھا۔ میرے قبیلے کے کئی خاندان اسلام قبول کر چکے ہیں۔ ہمارا ایرانی حاکم بھی مسلمان ہو چکا ہے لیکن میں نے اپنے اسلاف کا مذہب نہیں چھوڑا۔"

عاصم نے کہا۔ "تمہیں ایک بیوقوف آدمی کی باتوں سے پریشان نہیں ہونا چاہیے" پھر وہ تاجر کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اسے اپنے مکان کے ایک آراستہ کمرے میں بٹھا کر یہ پوچھ رہا تھا۔ "کیا تم واقعی مکہ سے ہو کر آئے ہو؟"

"ہاں مجھے جھوٹ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"کیا مسلمان واقعی مکہ پر قبضہ کر چکے ہیں؟"

"ہاں۔"

"جب جنگ ہوئی تھی تو تم وہاں تھے؟"

"مکہ فتح کرنے کے لیے مسلمانوں کو کسی بڑی لڑائی کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ قریش کا ایک گروہ معمولی مزاحمت کے بعد بھاگ گیا تھا۔ اس کے بعد اہلِ مکہ نے لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیئے تھے۔"

"یہ ناممکن ہے۔ میں قریش کے متعلق یہ نہیں مان سکتا کہ وہ جیتے جی ہار مان سکتے ہیں۔"

تاجر مسکرایا۔ "راستے میں جن قبائل کے لوگوں کے ساتھ میری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ سب یہی کہتے تھے، کہ قریش مکہ ہار نہیں مان سکتے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ واقعات دیکھے ہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ۔ مسلمانوں نے مکہ فتح کرنے کے بعد اپنے دشمنوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

"انہوں نے قریش کے ساتھ وہ سلوک کیا ہے جو آج تک کسی فاتح نے اپنے دشمن کے ساتھ نہیں کیا۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا لیکن مکہ میں داخل ہونے کے بعد مسلمانوں نے اپنے ان دشمنوں کو بھی معاف کر دیا تھا جو انہیں بدترین اذیتیں دیا کرتے تھے۔ ان کے نبیؐ نے ان لوگوں سے بھی باز پرس نہیں کی جو اس کے راستے میں کانٹے بچھایا کرتے تھے۔ اور جن کے ہاتھ کمزور اور بے بس مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ جب اسلام کا لشکر مکہ کی طرف بڑھ رہا تھا تو اہلِ مکہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ قدرت نے ہلاکت اور بربادی کے سارے طوفانوں کا رخ ان کی طرف پھیر دیا ہے۔ کسی کو چند گھڑیوں سے زیادہ زندہ رہنے کی امید نہ تھی لیکن تھوڑی

دیمز مدینہ طوفان رحمت کی گھٹاؤں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اہل مکہ کو صرف اس بات کا ملال تھا کہ ان کے ایک گروہ نے بلاوجہ مسلمانوں کے ساتھ الجھ کر تیرہ آدمیوں کی جانیں گنوادی ہیں۔ میں نے مسلمانوں کے نبیؐ کو پہلی بار اس وقت دیکھا تھا جب قریش کے اکابر گردنیں جھکائے ان کے سامنے کھڑے تھے اور وہ یہ پوچھ رہے تھے "تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کرنے والا ہوں؟" اور قریش کے اکابر یہ کہہ رہے تھے "تو شریف بھائی اور شریف برادر زادہ ہے۔"

عاصم نے بے چین سا ہو کر سوال کیا۔ "پھر مسلمانوں کے نبیؐ نے کیا جواب دیا؟"

اس کا جواب یہ تھا۔ "تم پر کچھ الزام نہیں جاؤ تم آزاد ہو۔"

عاصم نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔ "مجھے یقین ہے جو نبی ایک فاتح کی حیثیت سے اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ یہ سلوک کر سکتا ہے وہ پوری انسانیت کا نجات دہندہ ثابت ہوگا ——— خدا کی قسم! روم اور ایران کے لشکر اس دین کا راستہ نہیں روک سکیں گے جو ناداروں کو طاقت اور زیردستوں کو بالادستی عطا کرنے کے بعد بھی انتقام سے باز رکھ سکتا ہے۔"

تاجر نے کہا۔ "میرے لیے سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہی تھی کہ مسلمان ہجرت کے وقت جس قدر مظلوم تھے اس قدر اپنی فتح کے دن رحم دل تھے ——— قریش کے پرچم ٹوٹ چکے تھے۔ ان کا غرور خاک میں مل چکا ہے۔ کعبہ کے تین سو ساٹھ بت پاؤں تلے روندے جا چکے ہیں۔ لیکن اس عظیم فتح کے باوجود میں نے کسی مسلمان کے چہرے پر غرور کا شائبہ تک نہیں دیکھا۔ میں مختلف قبیلوں اور خاندانوں کے مسلمانوں سے مل چکا ہوں اور مجھے اس بات پر تعجب محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے دین کے رشتے کو خون کے رشتوں پر مقدم سمجھتے ہیں۔ میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ایک انسان اسلام قبول کرنے کے بعد ان تمام عادات اور خصائل سے محروم ہو جاتا ہے جن پر اہل عرب فخر کیا کرتے تھے۔"

عاصم نے کہا۔ "اور تم یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود مسلمان نہیں ہوئے۔"

تاجر نے جواب دیا۔ "ابھی میں نے ایک عرب کی زندگی کی راحتوں سے کنارہ کش ہونے کا فیصلہ نہیں کیا۔ ابھی اپنے دو بھائیوں کا قصاص میرے ذمے ہے اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اسلام قبول

کرنے کے بعد میرے سینے سے انتقام کی آگ بجھ جائے گی۔ اور اس کے بعد مجھے اپنی زندگی بے مزہ محسوس ہوگی۔"

عاصم نے کہا۔ "میرے دوست! تم مجھ سے زیادہ بدنصیب ہو۔ میں نے جوانی کے ایام میں اس احساس کے ساتھ اپنا وطن چھوڑا تھا کہ عرب کی پیاسی ریت کسی نیکی کو جنم نہیں دے سکتی۔ لیکن تم رحمت کے دریا کی طغیانیاں دیکھنے کے بعد بھی پیاسے ہو۔"

تاجر نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "مکہ میں چند دن قیام کے دوران میں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں ایک خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن اب میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ میں نے وہاں جو نئی روشنی دیکھی تھی وہ مرتے دم تک میرا تعاقب کرتی رہے گی۔ اور شاید ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب میں اپنے سارے تعصبات کے باوجود اس دین کی صداقت پر ایمان لانے پر مجبور ہو جاؤں گا جس نے مجھ سے کہیں زیادہ ضدی انسانوں کی کایا پلٹ دی ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اپنی ضد اور غرور کے معاملہ میں میں کوئی قبیلہ قریش کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا ——— میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ اہل عرب نے کئی برس جس دین کے راستے میں مزاحمت کی ہے وہ بڑی تیزی کے ساتھ عجم کی وسعتوں پر چھا جائے گا۔"

عاصم مسکرایا۔ "تم اسلام قبول کیے بغیر اسلام کی تبلیغ کر رہے ہو۔"

تاجر نے جواب دیا۔ "میں صرف اپنے احساس مرعوبیت کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ اور آج اگر تم عرب کے کسی یہودی سے بات کرو تو وہ تمہیں مجھ سے کہیں زیادہ مرعوب نظر آئے گا۔"

عاصم کچھ دیر بے خیالی کے عالم میں چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "کاش میں وہاں جا سکتا۔ کاش میں اسے دیکھ سکتا ——— پھر وہ تاجر کی طرف متوجہ ہوا۔ "آپ میرے مہمان ہیں اور جب تک آپ دمشق میں ہیں اس گھر کو اپنا گھر سمجھیے۔"

تاجر نے جواب دیا۔ "نہیں میں کل یروشلم کے راستے واپس جا رہا ہوں۔ اور اس وقت میرے ساتھی سرائے میں میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

تھوڑی دیر بعد عاصم اسے اپنے دروازے سے باہر رخصت کرتے ہوئے یہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے افسوس

ہے کہ آپ میرے پاس نہیں ٹھہر سکے۔ اب میں آپ کو ایک بار پھر یہ نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ان مسلمانوں کا ذکر کرنے میں احتیاط سے کام لیں۔ ایران کو شکست دینے کے بعد کوئی شامی یا رومی یہ سننا پسند نہیں کرتا، کہ اہلِ عرب ان کے لیے کسی خطرہ کا باعث ہو سکتے ہیں۔"

تاجر نے جواب دیا "میں آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا۔ آج مجھ سے جو حماقت ہوئی ہے اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ بازار میں ایک غسانی مسلمانوں کے متعلق اپنی ذاتی معلومات بیان کر رہا تھا۔ اور دو یہودی اس کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ چونکہ میری معلومات ان سب سے زیادہ تھیں اس لیے میں خاموش نہ رہ سکا۔"

اس واقعہ سے چند دن بعد دمشق میں یہ خبر گرم تھی کہ مسلمانوں کے خلاف غسانیوں کے حوصلے بلند رکھنے کے لیے شام کی سرحدی چوکیوں پر رومی سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ کیا جا رہا ہے اور قسطنطنیہ سے ہرقل کی تازہ افواج شام کے ساحل پر اتر رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات مشہور ہونے لگی کہ عنقریب غسانی اور رومی افواج عرب پر حملہ کر کے مسلمانوں کو کچل ڈالیں گی۔

عاصم کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اگر اہلِ شام نے عرب پر یلغار کر دی تو اس کا طرزِ عمل کیا ہو گا۔ جب وہ اپنے مستقبل کے متعلق سوچتا تو اس کے دل میں بار بار یہ خیال آتا کہ اب شام کے سوا میرا اور کوئی وطن نہیں۔ اس لیے اسے ہر اندرونی اور بیرونی خطرے سے محفوظ رہنا چاہیے۔ لیکن جب وہ اپنی ذات سے بالاتر ہو کر اس مسئلے پر غور کرتا تو وہ یہ محسوس کرتا کہ اسلام کے علمبرداروں کی شکست کے ساتھ عرب پھر ایک بار اپنے ماضی کی ظلمتوں کے آغوش میں چھپ جائے گا۔ وہ یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ جس دین کی قوت نے عربوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کر دیا ہے اس کے کمزور ہوتے ہی عرب کے قبائل پھر ایک بار اندرونی خلفشار کا شکار ہو جائیں گے۔ چنانچہ کبھی کبھی اس کے دل سے غیر شعوری طور پر یہ دعا نکل جاتی تھی کہ کاش شام اور روم کی افواج عربوں کے خلاف پیش قدمی کا ارادہ ترک کر دیں۔

باب ۴۳

ایک شام عاصم اور فسطینہ پائیں باغ میں بیٹھے ہوئے تھے اور نبطایونس پاس ہی ایک چھوٹی سی کمان کے ساتھ تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا۔ ایک نوکر بھاگتا ہوا عاصم کے قریب پہنچا اور اس نے ایک خط پیش کرتے ہوئے کہا۔ "جناب یروشلم سے کلاڈیوس کا ایلچی یہ خط لایا ہے۔"

عاصم نے خط کھول کر فسطینہ کو پیش کر دیا۔ اور اس نے کچھ کہے بغیر پڑھنا شروع کر دیا۔

کلاڈیوس نے لکھا تھا۔

میرے دوست! مسلمانوں کے عزائم کے متعلق ہمیں جو تازہ اطلاع ملی ہے وہ یہ ہے کہ ان کا نبی تیس ہزار لشکر کے ساتھ تبوک پہنچ چکا ہے۔ یہ پیش قدمی اس قدر غیر متوقع تھی کہ ہم غسانیوں کی مدد کے لیے کوئی لشکر نہیں بھیج سکے۔ اس لشکر میں دس ہزار سوار ہیں۔ اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ایلہ کے سردار نے مسلمانوں کی قوت سے مرعوب ہو کر جزیہ دینا منظور کر لیا ہے۔ مسلمانوں نے تبوک میں پڑاؤ ڈال دیا ہے۔ اور قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہ تبوک سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کریں۔ لیکن ہمارے جاسوس نے یہ اطلاع دی ہے کہ مسلمانوں کی فوج کا ایک جری سالار چند دستوں کے ساتھ تبوک سے آگے نکل گیا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کی منزل مقصود کیا ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ جو فوج تبوک سے آگے بڑھے گی اس کا ہر قدم تباہی کی طرف ہو گا ——— بہرحال ان کی جسارت قابلِ داد ہے۔ اور اگر میں تمہاری طرح عرب کا باشندہ ہوتا تو میرے

دل میں یقیناً یہ جاننے کی خواہش پیدا ہوتی کہ مسلمانوں کے لشکر نے کس امید پر شام کا رخ کیا ہے اور اس کی کامیابی کے امکانات کیا ہیں؟ اگر عرب سے تمہاری دلچسپی یکسر ختم نہیں ہو گئی تو میری یہ خواہش ہے کہ تم تبوک سے ہو آؤ۔ ہمارے پاس جاسوسوں کی کمی نہیں۔ وہ ہمیں ہر آن خبردار رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس اس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں کہ عربوں کی اس جرأت کی وجہ کیا ہے؟ اگر مسلمانوں کا لشکر تبوک سے واپس چلا گیا تو میری یہ خواہش ہوگی کہ تم یثرب سے ہو آؤ۔ اور ہمیں وہاں کے پورے حالات کی اطلاع دو۔ ممکن ہے کہ شام میں ہماری طاقت کے متعلق مسلمانوں کو تمہاری شہادت پر یقین آ جائے۔ اور وہ ایک ایسی جنگ کی ابتدا نہ کریں جس کا نتیجہ ان کے لیے تباہی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا——قیصر اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہے کہ مسلمانوں کی قوت میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے۔ ہماری فوجی نقل و حرکت کا مقصد صرف ان لوگوں کو مرعوب کرنا ہے۔ رومی لشکر میں ایک ایسا عنصر موجود ہے جو کسی نئی جنگ کو پسند نہیں کرتا اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اپنی پوری تیاریوں کے باوجود تبوک کے محاذ کی طرف پیش قدمی کا فیصلہ نہیں کیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم عرب کے حالات سے غافل رہ سکتے ہیں۔ اگر تبوک میں جنگ چھڑ گئی تو مجھے جس قدر اپنی فتح کا یقین ہے اسی قدر اس بات کا یقین ہے کہ عربوں کو پسپا کرنے کے بعد ہم صحرا کے آخری کونے تک ان کا پیچھا کریں گے۔ اور قیصر صرف اپنے ان مشیروں کی بات سنے گا جو لڑائی کو ایک کھیل سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اب بھی میرا خط پہنچنے سے دو چار دن بعد تمہیں یہ اطلاع مل جائے کہ جنگ شروع ہو چکی ہے اور ہم نے پہلے معرکے میں ہی مسلمانوں کو میلوں پیچھے دھکیل دیا ہے۔ اس صورت میں بھی مسلمانوں کے لیے ایک ایسے حقیقت پسند آدمی کے مشورے سودمند ہوں گے جو انہیں یہ سمجھا سکے کہ روم اور عرب کے جنگی وسائل کے درمیان کتنا فرق ہے اور میرے خیال میں اس خدمت کے لیے کوئی اور تم سے

بہتر نہیں ہو سکتا۔ یہ باتیں میں نے رومی لشکر کے ایک افسر کی حیثیت سے لکھی ہیں لیکن ایک انسان کی حیثیت سے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ شاید وہ روشنی جس کی تلاش میں تم اپنے گھر سے نکلے تھے تمہارے اپنے وطن سے نمودار ہو چکی ہے اور انسانی تاریخ کا وہ دور شروع ہو چکا ہے جس کے لیے فرمس جیسے لوگ چشم براہ تھے۔ میرے نزدیک اس صورت میں بھی تمہارا وہاں جانا ضروری ہے۔ اور یہ اس لیے ضروری ہے کہ میں عرب کے انقلاب کے متعلق تم سے زیادہ کسی اور کی گواہی پر یقین نہیں کر سکتا۔ تمہارے لیے تبوک میں... مسلمانوں کے پڑاؤ تک رسائی حاصل کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ تم چند دن ان کے ساتھ رہ کر یہ معلوم کر سکو گے کہ قدرت کا وہ کونسا معجزہ ہے جس کی بدولت عربوں کے دل سے دنیا کی عظیم سلطنت کا رعب اٹھ گیا ہے۔ اگر یہ لوگ تبوک سے واپس چلے گئے تو بھی تمہارے لیے اپنے وطن میں داخل ہونا مشکل نہیں ہوگا——اگر دنیا کے حال اور مستقبل کے متعلق تمہاری دلچسپیاں ختم نہیں ہو گئیں تو جلد از جلد یروشلم پہنچنے کی کوشش کرو۔

تمہارا دوست

کلاڈیوس

فسطینہ خط ختم کرنے کے بعد جواب طلب نگاہوں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔ اور تھوڑی دیر بعد جب اُسے عاصم کی خاموشی تکلیف دہ محسوس ہونے لگی تو اس نے دبی زبان میں پوچھا۔ "کیا آپ وہاں جانا چاہتے ہیں؟"

"مجھے معلوم نہیں"۔ عاصم نے جواب دیا۔

فسطینہ بولی۔ "لیکن مجھے معلوم ہے"۔ اور اس کے مغموم چہرے پر ایک مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

"تمہیں کیا معلوم ہے؟"

"یہی کہ آپ کسی دن وہاں ضرور جائیں گے اور میں یہ نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ترک کر دیں۔"

"میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ وہاں جانا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔"

فسطینہ نے جواب دیا۔ "آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کے دل کا حال جانتی ہوں۔ اور میرے متعلق آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ میں آپ کا انتظار کرسکوں گی۔ بڑھاپے میں یہ انتظار میرے لیے زیادہ صبر آزما ہوگا۔ اس لیے میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ جلد جائیں اور جلد واپس آجائیں۔"

"لیکن میں وہاں جاکر کیا کروں گا؟"

"مجھے معلوم نہیں۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ کسی دن آپ اچانک وہاں جانے کا فیصلہ کریں گے اور میری التجائیں اور آنسو آپ کا راستہ نہیں روک سکیں گے۔ لیکن میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں اپنی محبت کو آپ کے پاؤں کی زنجیر نہیں بننے دوں گی۔ میں زندگی کے سفر میں آپ کی رفیق ہوں۔ لیکن اس سفر کی منازل متعین کرنا آپ کا کام ہے۔"

عاصم نے پیار سے فسطینہ کی ٹھوڑی پکڑ کر اُسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس وقت میری منزل میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اور اس وقت میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ میں اِن خوب صورت آنکھوں کی گہرائیوں میں گم ہوجاؤں اور کسی اور طرف نہ دیکھوں۔"

فسطینہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "اور میری آنکھوں کی گہرائیوں میں بھی شاید آپ وہ صحرا اور نخلستان دیکھ سکیں جو آپ کو ساری دنیا سے زیادہ عزیز ہیں۔"

عاصم نے جواب دیا۔ "میں ان صحراؤں اور نخلستانوں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکا ہوں۔ اب اگر میں وہاں گیا بھی تو وہاں مجھے ماضی کی تلخ یادوں کے سوا کیا حاصل ہوسکتا ہے؟"

"آپ نے جس وطن کو چھوڑا تھا وہ اب درندوں کی شکار گاہ نہیں۔ بلکہ انسانیت کی بلند ترین اقدار کا مرکز بن چکا ہے۔ کلاڈیوس کے اس خط کے بعد میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ جس زمین کے کانٹوں سے آپ کے پاؤں زخمی ہوئے تھے وہاں پھولوں کی مسکراہٹیں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ جب آپ وہاں سے ہو کر واپس آئیں گے تو میں آپ کے منہ سے صرف یہ سننا پسند کروں گی کہ آپ نے کوئی ایسی جگہ تلاش کرلی ہے جہاں شہنشاہوں کی قبائیں محکوموں کے خون سے داغدار نہیں ہوتیں۔ جہاں ایک انسان کے ہاتھ دوسرے

انسان کی شاہرگ تک نہیں پہنچتے۔ اور جہاں ہمارے بیٹے کا مستقبل شام سے زیادہ محفوظ ہے۔ میں آپ کے لیے یہ سفر اس لیے بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ اگر عرب کے نبی اور اس پر ایمان لانے والوں کو قریب سے دیکھ کر آپ کی توقعات پوری نہ ہوئیں تو ہم اپنی زندگی کے باقی دن نسبتاً اطمینان کے ساتھ گزار سکیں گے۔ اور مستقبل کے متعلق موہوم امیدیں آپ کو پریشان نہیں کریں گی۔ عاصم! رات کی تاریکی صرف ان مسافروں کیلئے صبر آزما ہوسکتی ہے جنہیں طلوع سحر کی امید ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر عرب کا انقلاب آپ کو نئی روشنی دکھلانے سے قاصر رہا تو ہمارے لیے زندگی کی ان راحتوں پر قناعت کرلینا مشکل نہیں ہوگا جو ہمیں اس گھر کی چار دیواری کے اندر میسر ہیں۔ پھر میں صبح و شام آپ کی مغموم نگاہوں کو خلا میں بھٹکتے ہوئے نہیں دیکھوں گی پھر مجھے رات کے پچھلے پہر اس بات کا احساس پریشان نہیں کرے گا کہ میرا شوہر آرام کی نیند سونے کی بجائے کرب کی حالت میں کمرے سے باہر ٹہل رہا ہے۔"

عاصم نے کہا۔ "فسطینہ تم زندگی کا سب سے بڑا انعام ہو۔ اور اگر تم نے کبھی میری نگاہوں کو فضا میں بھٹکتے یا مجھے رات کے پچھلے پہر بے چین اور مضطرب دیکھا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں اس دنیا کو تمہارے لیے زیادہ مکمل، زیادہ پُرامن اور زیادہ خوشحال دیکھنا چاہتا ہوں —— میں نے ماضی میں بے گناہوں کے خون کی ندیاں دیکھی ہیں۔ میں نے مظلوموں کے آنسوؤں کو خاک میں جذب ہوتے دیکھا ہے۔ میں نے بے بسوں کی چیخوں کے جواب میں ظالموں کے قہقہے سنے ہیں۔ میں نے غلاموں کی ہڈیوں پر حکمرانوں کو اپنے عشرت کدے تعمیر کرتے دیکھا ہے۔ میں نے محبت کے پھولوں کو نفرت اور غرور کے جہنم کا ایندھن بنتے دیکھا ہے۔ اور میری زندگی میں ایک وقت ایسا بھی تھا جب میں یہ سب کچھ برداشت کرسکتا تھا۔ لیکن یونس کی دنیا کو میں اپنی دنیا سے مختلف دیکھنا چاہتا ہوں —— کاش میں یونس کے لیے ایسی دنیا تلاش کرسکوں جہاں ایک بے بس، کمزور اور مظلوم کے آنسوؤں سے پوری انسانیت کا ضمیر لرز اٹھے جہاں ناداروں کی زبان فریاد کے لیے نہیں بلکہ تشکر کے لیے کھلتی ہو —— کاش عرب میں ایسی دنیا تعمیر ہورہی ہو۔"

فسطینہ نے اچانک سوال کیا۔ "آپ کب جانا چاہتے ہیں؟"

عاصم نے جواب دیا۔ "ابھی میں نے جانے کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ لیکن اگر تم خوشی سے اجازت دے رہی ہو۔ تو میں تمہارا شکر گزار ہوں۔"

اگلی صبح عاصم گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کے لیے نکلا لیکن جلدی ہی واپس آ گیا۔ فسطینہ نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "آپ اتنی جلدی واپس کیوں آ گئے؟"

عاصم نے جواب دیا۔ "میں نے گھر سے نکلتے ہی ایک ناقابلِ یقین خبر سنی ہے ——— مسلمانوں کی ایک فوج نے اچانک دومۃ الجندل پر حملہ کر کے وہاں کے سردار اکیدرؓ بن عبدالملک کو گرفتار اور اس کے بھائی کو قتل کر دیا ہے۔"[1]

"یہ ناممکن ہے۔"

"میں فوج کے ایک ذمہ دار افسر سے اس خبر کی تصدیق کر چکا ہوں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا مسلمانوں کی فوج اتنی زیادہ تھی کہ ہمارا لشکر ان کا راستہ نہیں روک سکا۔"

"ان کی تعداد چار پانچ سو سواروں سے زیادہ نہیں تھی۔ اور رومیوں کی کمک پہنچنے سے پہلے وہ اکیدر کو گرفتار کر کے واپس جا چکے تھے۔" ایک رومی یہ کہہ رہا ہے کہ اگر یہ خبر درست ہے تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسلمان ہوا میں اڑ کر دُومہ پہنچے تھے۔"

"اب کیا ہو گا۔" فسطینہ نے سوال کیا۔

"کچھ نہیں۔ رومیوں کا خیال تھا۔ کہ ان کی فوجی نقل و حرکت مسلمانوں کو مرعوب کر دے گی۔ لیکن اب مسلمانوں نے عملاً یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ جب چاہیں شام کے کسی بھی شہر پر حملہ کر سکتے ہیں۔"

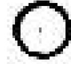
"لیکن یہ قیصر کی توہین ہے اور رومی اسے برداشت نہیں کریں گے۔"

نوٹ: [1] رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک پہنچ کر حضرت خالد بن ولیدؓ کو دومہ کی مہم پر روانہ کر دیا تھا۔ حضرت خالدؓ کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ وہ رومی لشکر کے حرکت میں آنے سے قبل اس مہم سے فارغ ہو کر واپس جا چکے تھے۔

عاصم نے جواب دیا۔ "یہ بھی ممکن ہے کہ ان واقعات کے بعد مسلمانوں کی قوت کے متعلق قیصر کے اندازے بدل جائیں اور وہ فوری جنگ کا ارادہ بدل دے۔"

فسطینہ نے کہا۔ "نہیں قیصر کو کلیسا کی خواہشات کا احترام کرنا پڑے گا۔ اور کلیسا کی خواہش یہ نہیں ہو سکتی کہ اہلِ عرب ایک کمزور ہمسایہ کی بجائے ایک طاقتور حریف کی حیثیت اختیار کر لیں۔ مجھے یقین ہے کہ قیصر جوابی کاروائی میں زیادہ تاخیر سے کام نہیں لے گا۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

عاصم نے جواب دیا۔ "اگر تم سفر کے متعلق پوچھ رہی ہو تو میں نے ابھی کوئی ارادہ نہیں کیا۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر عرب اور روم کے درمیان باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی تو میں وہاں نہیں جا سکوں گا۔ اور کلاڈیوس بھی مجھے وہاں جانے کا مشورہ نہیں دے گا۔"



چند دن بعد اہلِ دمشق یہ خبر سن رہے تھے کہ لشکرِ اسلام تبوک سے واپس لوٹ گیا ہے۔ اس کے بعد عاصم یروشلم جانے کے ارادے کو اگلے دن، اگلے ہفتے اور اگلے مہینے پر ٹالتا رہا۔ اور کلاڈیوس نے بھی اُسے دوبارہ ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ تقریباً ایک سال گزر گیا اور اس عرصہ میں شام کی مشرقی سرحد سے کوئی ایسی خبر نہ آئی جو رومیوں کے لیے کسی تشویش کا باعث ہو سکتی تھی۔ تاہم اسلام ایک حیرت انگیز رفتار کے ساتھ جزیرہ نمائے عرب کی وسعتوں کو اپنے آغوش میں لے رہا تھا۔ اور رومی جن کے نزدیک فرزندانِ صحرا کا اتحاد عرب کی تاریخ کا ایک ناقابلِ یقین واقعہ تھا۔ اس صورتِ حال سے غافل نہ تھے۔

ایک شام عاصم دمشق کے بازار میں گھومنے کے بعد گھر واپس آیا۔ تو نوکر نے اُسے بتایا کہ اندر ایک مہمان آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ جلدی سے آگے بڑھا اور ایک کشادہ اور روشن کمرے کے قریب پہنچ کر اُسے ایک مانوس آواز سنائی دی اور وہ "کلاڈیوس! کلاڈیوس!!" کہتا ہوا اندر داخل ہوا۔

کلاڈیوس یونس کو اپنی گود سے اتار کر اٹھا۔ اور دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔

"تم کب آئے۔ تم نے مجھے اطلاع کیوں نہ دی سانطونیہ کیسی ہے؟ تمہارے بچے کیسے ہیں؟ تم انہیں ساتھ کیوں نہیں لائے؟" عاصم نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر دیے۔

"وہ سب ٹھیک ہیں۔ اگر یہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہوتا تو انہیں ضرور لاتا۔ لیکن میں علی الصباح انطاکیہ جا رہا ہوں۔"

"میں نے سنا ہے کہ قیصر وہاں آ رہا ہے؟"

"ہاں۔ عرب کے حالات نے انہیں پھر ایک بار اپنے مشرقی علاقوں کی دیکھ بھال پر مجبور کر دیا ہے۔"

عاصم نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ تمہاری دعوت پر یروشلم نہ آسکا۔ میں نے کئی بار سفر کا ارادہ کیا۔ لیکن اب شاید میں عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا ہوں جب کہ ایک انسان کی قوتِ عمل اس کے ارادوں کا ساتھ نہیں دیتی۔ آپ کہتے ہیں کہ عرب کے حالات نے قیصر کو انطاکیہ آنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ تبوک سے واپسی کے بعد مسلمانوں کے ارادے بدل گئے ہیں۔ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ اگر موتہ کا حاکم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ایلچی کو قتل کرنے کی غلطی نہ کرتا تو وہ شام کی سرحدوں کی طرف کبھی نہ دیکھتے۔"

کلاڈیوس نے کہا "میں مسلمانوں کے عزائم کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اسلام کے ساتھ عرب میں جو انقلاب رونما ہو رہا ہے وہ انسانی تاریخ کا ایک عظیم ترین معجزہ ہے۔ موتہ اور تبوک پر ان کے حملے ہمارے لیے کسی بڑی پریشانی کا باعث نہ تھے لیکن ان کے چند مہینوں میں عرب کی جو کایا پلٹ ہوئی ہے وہ ہمارے لیے سرحدی لڑائی سے کہیں زیادہ تشویش ناک ہے۔ پچھلے سال جب میں نے تمہیں یروشلم آنے اور وہاں سے تبوک یا اس سے آگے اپنے وطن کی سیاحت کی دعوت دی تھی تو مجھے یقین تھا کہ عرب کے تازہ حالات سنتے ہی تم سفر پر آمادہ ہو جاؤ گے۔ میں تمہیں رومی حکومت کے ایک جاسوس کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ایسے انسان کی حیثیت سے وہاں بھیجنا چاہتا تھا۔ جس کی گواہی پر مجھے یقین آسکتا تھا۔ موتہ اور اس کے بعد تبوک پر مسلمانوں کے حملوں کی نسبت میرے لیے یہ بات کہیں زیادہ

اہم تھی کہ اسلام نے شراب، جوئے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ اور اس کے باوجود عرب جوق در جوق یہ دین قبول کر رہے ہیں۔ اسلام نے چوری اور بدکاری کے لیے ہولناک سزائیں مقرر کی ہیں۔ اور عربوں کی تمام وہ بری عادات یکسر بدل دی ہیں جن پر وہ صدیوں سے فخر کرتے چلے آ رہے تھے۔ مکہ میں قریش کی شکست کے بعد بھی ہم یہ سوچتے تھے کہ عرب کے طول و عرض میں ان بتوں کی پوجا کرنے والے قبائل پوری شدت کے ساتھ اسلام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے، جو کعبہ کے اندر توڑ دیے گئے ہیں۔ ہمیں یہ بھی یقین تھا کہ عربوں کی قبائلی عصبیتیں انہیں ہمیشہ ایک ایسے دین کے خلاف اکساتی رہیں گی جس کا مقصد نسل اور خون کے امتیازات کو مٹانا ہے۔ پھر ہماری آخری امید یہ تھی کہ جب مسلمان مکہ سے آگے بڑھیں گے تو انہیں سینکڑوں قبائل کی متحدہ قوت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور ان کا انجام اس ندی سے مختلف نہیں ہوگا جو بالآخر صحرا کی پیاسی ریت میں جذب ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن گزشتہ ایک سال کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عرب کے انقلاب کی وسعت اور گیرائی ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ عرب سے آئے دن ہمیں صرف اس قسم کی اطلاعات ملتی ہیں کہ آج فلاں قبیلے کے وفد نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضری دی ہے اور آج فلاں علاقے کے اتنے خاندان مسلمان ہو گئے ہیں۔ جو لوگ چند سال قبل اسلام کے مبلغین کو قتل کیا کرتے تھے اب اسلام کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بذاتِ خود مدینہ جاتے ہیں مجھے تمام قبائل کے نام یاد نہیں ہیں لیکن تم حیران ہو گے کہ حضرموت اور یمن سے لے کر یمامہ تک عرب کے بیشتر قبائل اسلام قبول کر چکے ہیں۔ قریش مکہ نے کافی مدت مقابلہ کرنے کے بعد اپنی شکست کا اعتراف کیا تھا۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورا عرب اس دین کی بے پناہ اخلاقی اور روحانی قوت کے سامنے ہتھیار ڈال چکا ہے۔ یہ لوگ اپنے ہاتھوں سے اپنے اسلاف کے بت توڑ رہے ہیں۔ اہلِ عرب پہلی بار ایک حکومت کے جھنڈے تلے متحد اور منظم ہو رہے ہیں۔ اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جب شاہراہِ حیات کا یہ نیا قافلہ اپنی منازل کی طرف رخ کرے گا تو روم اور ایران کی ساری عظمتیں اس کے راستے کے گرد و غبار میں گم ہو کر رہ جائیں گی۔"

کلاڈیوس یہ کہہ کر خاموش ہو گیا اور عاصم اور فسطینہ دیر تک سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھتے

رہے ہو۔ بالآخر عاصم نے کہا۔ "آپ مجھے دوبارہ اپنے وطن جانے کی دعوت دے رہے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ اس دفعہ میں شاید انکار نہ کر سکوں۔"

کلاڈیوس نے جواب دیا۔ "عاصم! اگر میں ایک عرب ہوتا اور تمہاری طرح وہاں کے حالات سے مایوس اور بددل ہو کر نکلتا اور پھر غریب الوطنی میں مجھے کوئی یہ مژدہ سناتا کہ جس زمین پر تم نے جہالت اور ظلم کی اندھی اور بہری قوتوں کی ہولناکیاں دیکھی تھیں، وہاں رحم، عدل اور انصاف کے چراغ روشن کیے جا رہے ہیں تو میرے دل میں وہاں جانے کی خواہش ضرور بیدار ہوتی ——— عاصم تم میرے دوست اور محسن ہو۔ تم نے مجھے موت کے جبڑوں سے نکالا تھا۔ اور میں اس احسان کا بدلہ چکانے کے لیے تمہیں قسطنطنیہ لے گیا تھا۔ لیکن آج میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر عرب کے متعلق جو کچھ میں نے سنا ہے صحیح ہے تو زندگی کی جو مسرتیں وہاں تمہارا انتظار کر رہی ہیں وہ شاید تمہیں قیصر کے ایوان میں بھی نصیب نہ ہوں۔ اگر خدا کو عرب کی حالت پر رحم آگیا ہے اور وہاں اس کی رحمتوں کا نزول ہو رہا ہے تو میں یہ چاہتا ہوں کہ تم وہاں جا کر اپنا دامن بھر لو۔ اگر عرب کے متعلق میری معلومات سراسر غلط نہیں تو میں پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم وہاں جا کر واپس آنے کی بجائے فسطینہ اور یونس کو بھی وہیں بلا لو گے اور اس کے بعد یہ ممکن ہے کہ زندگی میں ہماری ملاقات نہ ہو سکے۔ لیکن میرے لیے یہ اطمینان کافی ہو گا کہ تم اس دنیا میں اپنا صحیح مقام حاصل کر چکے ہو۔"

عاصم بولا۔ "کلاڈیوس سچ کہو۔ کیا میرے متعلق تمہارے اضطراب کی وجہ یہ نہیں کہ تم میرے لیے دمشق کو غیر محفوظ سمجھتے ہو؟"

کلاڈیوس نے جواب دیا۔ "میرے دوست! تم یہ جانتے ہو کہ تمہاری حفاظت کے لیے میں اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں۔"

"یہ میں جانتا ہوں۔ لیکن تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

کلاڈیوس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "اگر تم اس سوال کے جواب پر اس قدر مصر ہو تو سنو! میں ان لوگوں میں سے ہوں جو عرب کے ساتھ رومی حکومت کا تصادم ناگزیر سمجھتے ہیں اور جب سے میں نے یہ

سنا ہے کہ نجران کے تمام عیسائی قبائل مسلمان ہو چکے ہیں۔ اور بعض غسانی رؤسا بھی اسلام کی طرف مائل ہیں۔ میرا یہ یقین اور پختہ ہو گیا ہے کہ کلیسا کے اکابر قیصر کو زیادہ دیر آرام سے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ وہ عیسائیت کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھانے پر مجبور ہو جائے گا ——— اور مجھے یہ کہتے ہوئے ندامت محسوس ہوتی ہے کہ جب عرب اور شام کا معرکہ شروع ہو گا تو تم یہاں صرف ایک عرب کی حیثیت سے دیکھے اور پہچانے جاؤ گے جن لوگوں نے فسطینہ کے نانا کو اس کی عظیم خدمات کے باوجود ایرانیوں کا طرفدار سمجھ کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، وہ تمہاری خدمات کا لحاظ نہیں کریں گے ——— تمہارے خلاف عوام کو مشتعل کرنے کے لیے کسی متعصب پادری کا یہ کہہ دینا کافی ہو گا۔ کہ تم یثرب کے باشندے ہو اور تمہاری دلی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ ان حالات میں رومی حکومت کو اپنی وفاداری کا ثبوت دینے کے لیے تم عربوں کے خلاف تلوار اٹھانے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ عاصم میں تمہیں اس امتحان سے بچانا چاہتا ہوں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ تمہاری جنگ کسی دشمن کے خلاف نہیں بلکہ اپنے ضمیر کے خلاف ہو گی اور میرے نزدیک تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو اپنے ضمیر کی موت کے بعد صرف اس بات پر قانع رہ سکتے ہیں کہ انہیں چند سال اور زندگی کے سانس لینے کی مہلت مل گئی ہے۔"

فسطینہ نے کلاڈیوس سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میں اس گھر کے بدلے اپنے شوہر کے ضمیر کی قربانی مانگوں گی تو آپ غلطی پر ہیں۔ خدا کی قسم! اگر اہل روم اتنے ناشکر گزار ہیں تو میں اسی وقت دمشق چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ میرے لیے صحرا کا ایک جھونپڑا زیادہ آرام دہ ہو گا۔"

کلاڈیوس نے جواب دیا۔ "میری بہن، تم سین کی بیٹی ہو اور تمہارے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ جنگ کے وقت قوموں کی تقدیر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آ جاتی ہے جو دوست اور دشمن میں تمیز نہیں کرتے یہ ہو سکتا ہے کہ جنگ شروع نہ ہو اور دمشق میں آپ کی ساری زندگی خیریت سے گزر جائے لیکن یہ ممکن نہیں کہ جنگ شروع ہو جائے اور عاصم اس سے الگ تھلگ رہ کر اس گھر کے اندر اطمینان کا سانس لے سکے۔ جنگ کے ایام میں قیصر کی رعایا کا جو فرد مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھانے میں پس و پیش کرے گا، اُسے حکومت کلیسا کا دشمن سمجھا جائے گا۔ میری باتوں کو برا نہ مانیں۔ میں اس وقت جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ دوستی کے

تقاضوں سے مجبور ہو کر کہہ رہا ہوں۔ کلاڈیوس یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اور عاصم دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے فسطینہ کی طرف دیکھا اور کہا ”فسطینہ! ہم وہاں جا رہے ہیں۔ ہم تینوں وہاں جا رہے ہیں۔ تم تیار ہو جاؤ۔ ہم تین دن کے اندر اندر یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔“

فسطینہ نے جواب دیا۔ ”میں کل ہی روانہ ہونے کے لیے تیار ہوں۔“

کلاڈیوس نے کہا۔ ”نہیں عاصم یہ بہتر ہو گا کہ میں انطاکیہ سے واپس آجاؤں۔ اس کے بعد میں عرب کی سرحد تک تمہارے سفر کا انتظام کر دوں گا۔“

”آپ کب واپس آئیں گے؟“

”مجھے دس دن سے زیادہ نہیں لگیں گے۔“

فسطینہ نے کہا۔ ”مجھے ڈر ہے کہ دس دن بعد ان کا ارادہ بدل جائے گا۔“

عاصم مسکرایا۔ ”میں اپنے لیے نہیں یونس کے لیے جا رہا ہوں ——— اور اب اگر روم کی پوری فوج میرے راستے میں کھڑی ہو جائے تو بھی میں اپنا ارادہ تبدیل نہیں کروں گا۔“

باب ۴۴

قریباً دو ماہ بعد ایک سہ پہر کے وقت عاصم اور فسطینہ ایک ٹیلے کے سائے میں گھوڑے روک کر سامنے یثرب کی پہاڑیوں اور نخلستانوں کے مناظر دیکھ رہے تھے۔ یونس جس کا چہرہ گرمی سے مرجھایا ہوا تھا۔ اپنے باپ کے ساتھ سوار تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”اباجان! یہ آپ کا شہر ہے؟“

”ہاں، بیٹا۔“

”پھر آپ رک کیوں گئے ہیں۔ مجھے پیاس لگ رہی ہے۔“

”گھبراؤ نہیں بیٹا، ہم ابھی وہاں پہنچ جائیں گے۔“ عاصم نے یہ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

تھوڑی دیر بعد یونس نے پوچھا۔ ”اباجان! وہاں پانی مل جائے گا نا؟“

”ہاں بیٹا! وہاں تمہارے لئے کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔“

وہ کچھ دیر خاموشی سے چلتے رہے۔ عاصم کے دل کی گہرائیوں سے ماضی کی ان گنت یادیں ابھر رہی تھیں اور وہ نمی جو اس نے یثرب کی پہلی جھلک دیکھتے وقت اپنی آنکھوں میں محسوس کی تھی بتدریج آنسوؤں میں تبدیل ہو رہی تھی۔

جب وہ ایک نخلستان کے قریب سے گزر رہے تھے تو عاصم نے مڑ کر فسطینہ کی طرف دیکھا اور اپنا گھوڑا روک کر کہا۔ ”فسطینہ یہ سمیرا کا گھر ہے اور اب شاید وہاں مجھے پہچاننے والا بھی کوئی نہ ہو۔“

یونس نے سوال کیا۔ ”اباجان! یہاں کے لوگ کسی کو پہچانے بغیر پانی نہیں دیتے؟“

”نہیں، بیٹا اس گھر کے مکین پانی مانگنے والوں کو دودھ پیش کیا کرتے ہیں۔“ عاصم یہ کہہ کر تھوڑی دیر کے

کے لئے ماضی کی وسعتوں میں کھو گیا۔

فسطینہ نے سوال کیا۔ "آپ وہاں جانا چاہتے ہیں؟"

عاصم نے جواب دیا۔ "ہاں! یہ گھر میرے لئے اپنے گھر سے کم اہمیت نہیں رکھتا اور نعمان کا حال معلوم کئے بغیر یہاں سے گزر جانا مجھے کافی صبر آزما محسوس ہوتا ہے۔"

"اباجان! نعمان کون ہے؟" یونس نے سوال کیا۔

"وہ میرا دوست تھا بیٹا!"

"تو پھر آپ میرے لئے پانی کیوں نہیں منگواتے۔"

ایک لڑکا جس کی عمر دس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی، باغ سے نمودار ہوا اور اس نے کہا۔

"آپ کو پانی چاہئے۔"

"ہاں۔" عاصم نے جواب دیا۔ "تم اس گھر میں رہتے ہو؟"

"ہاں۔"

"تمہارا کیا نام ہے؟"

"میرا نام عبداللہ ہے۔"

"تم نعمان کو جانتے ہو؟"

"وہ میرے اباجان ہیں، آئیے، اندر آئیے!" عبداللہ نے یہ کہہ کر عاصم کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔

عاصم نے یونس کو بازو سے پکڑ کر نیچے اتارتے ہوئے کہا۔ "تم اپنے اس ننھے مہمان کو پانی پلا دو۔"

"آپ کو ہمارا مہمان بننا پسند نہیں۔"

"نہیں، اس وقت ہم آگے جا رہے ہیں۔ تم اسے جلدی لے آؤ۔"

"بہت اچھا۔" عبداللہ نے یہ کہہ کر یونس کا ہاتھ پکڑ لیا، اور وہ باغ میں غائب ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئے تو ان کے ساتھ ایک خوش وضع آدمی تھا۔ عاصم اسے دیکھتے ہی گھوڑے سے اتر پڑا۔ نو وارد نے کہا۔ "میرے بیٹے کو یہ شکایت ہے کہ دو معزز مسافر پیاس کے باوجود ہمارے

گھر میں پاؤں رکھنا پسند نہیں کرتے۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"ہم بہت دور سے آئے ہیں؟"

"میرا بیٹا یہ بھی کہتا ہے کہ آپ کو میرا نام معلوم ہے اور اگر یہ درست ہے تو آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ میرے گھر کا دروازہ مہمانوں کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔"

عاصم نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے کہ اس گھر کے مکین اپنے دشمنوں سے بھی نفرت نہیں کرتے۔" اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

یونس نے شکایت کے لہجے میں کہا۔ "ہاں، اباجان! میں نے پانی مانگا تھا اور یہ مجھے زبردستی دودھ پلانا چاہتے تھے۔"

عاصم کی قوتِ ضبط جواب دے چکی تھی۔ اس نے کہا۔ "نعمان! تم نے مجھے پہچانا نہیں ہے؟"

وہ ایک ثانیہ سکتے کے عالم میں کھڑا رہا اور پھر عاصم، عاصم! کہتا ہوا اس کے ساتھ لپٹ گیا۔

"میرے دوست! میرے بھائی! تم کہاں تھے۔ میں اور سالم تمہاری تلاش میں عرب و عجم کی خاک چھان چکے ہیں۔ اور اب تم میرے گھر کے دروازے سے باہر کھڑے ہو؟"

نعمان کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر مسکراہٹیں تھیں۔

اچانک وہ عاصم کو چھوڑ کر فسطینہ کی طرف متوجہ ہوا۔

عاصم نے کہا۔ "نعمان! یہ میری بیوی ہے۔"

"آئیے!" نعمان نے یہ کہہ کر فسطینہ کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ عبداللہ نے عاصم کا گھوڑا سنبھال لیا۔

اور وہ اس باغ کے اندر داخل ہوئے جو عاصم کو اپنی جوانی کی امنگوں کا قبرستان محسوس ہوتا تھا۔

نعمان نے کہا۔ "اگر آپ تھوڑی دیر پہلے آتے تو سالم سے یہیں ملاقات ہو جاتی۔"

عاصم نے پوچھا۔ "سعاد کیسی ہے؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔"

"عباد زندہ ہے۔"

"نہیں وہ آپ کے جانے سے دو سال بعد فوت ہو گیا تھا۔ مرنے سے قبل اُس کا آخری کارنامہ یہ تھا کہ اُس نے شمعون کو قتل کر دیا تھا۔"

باغ عبور کرنے کے بعد وہ مکان کے صحن میں داخل ہوئے۔ وہاں ایک عورت اُون کات رہی تھی، اور ایک کمسن بچی اُس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ عورت نعمان کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر جلدی سے اُٹھی اور بھاگتی ہوئی کمرے کے اندر چلی گئی۔ ایک نوکر گھوڑے لے کر اصطبل کی طرف چلا گیا اور یہ سب کھلی ہوا میں ایک چٹائی پر بیٹھ گئے۔ نعمان نے انہیں پانی پلایا اور پھر عبداللہ سے کہا۔ "بیٹا تم سالم کو بلا لاؤ۔"

عاصم نے کہا۔ "میں اپنے خاندان میں سب سے پہلے سعاد کو دیکھنا چاہتا ہوں، اس لئے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ میں خود چلا جاؤں۔"

نعمان نے کہا۔ "سعاد بھی یہیں آجائے گی۔"

عاصم نے کہا۔ "یہ بات مجھے ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہے۔"

"اب آپ کے گھرانے کا کوئی فرد اس گھر کے لئے اجنبی نہیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

نعمان یہ کہہ کر مکان کے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اُس کی بیوی جو چرخہ چھوڑ کر اندر چلی گئی تھی اُس کے ساتھ تھی۔

عاصم نے اچانک اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی بیوی کو پریشان دیکھ کر نعمان نے کہا۔ "سعاد! تم نہیں جانتیں یہ کون ہیں؟"

اُس نے عاصم کی طرف غور سے دیکھا۔ چند قدم آگے بڑھی، جھجکی اور پھر اخی! اخی! کہتی ہوئی بے اختیار اُس سے لپٹ گئی۔ "مجھے یقین تھا کہ تم زندہ ہو — تم کسی دن ضرور آؤ گے۔ اور میں ہر نماز کے ساتھ یہ دُعا کیا کرتی تھی کہ میں تمہاری واپسی تک زندہ رہوں۔" پھر اُس کے الفاظ سسکیوں میں ڈوب کر رہ گئے، اور سسکیاں دبی دبی چیخوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ کمسن لڑکی جو حیرت کے عالم میں یہ منظر دیکھ رہی تھی اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور فسطینہ نے اُسے اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔

سعاد اپنے آنسو پونچھنے کے بعد فسطینہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ "بہن مجھے معاف کرنا۔ میں تھوڑی

دیر کے لئے مہمان نوازی کے آداب بھول گئی تھی۔"

فسطینہ نے جواب دیا۔ "بہن میرے لئے آپ کے جذبات کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ آپ کا بھائی اکثر آپ کا ذکر کیا کرتا تھا۔ اور جب میں آپ کا تصور کرتی تھی تو مجھے یہ تسکین ہوتی تھی کہ آپ کی ہمسائگی میں مجھے غریب الوطنی کا احساس نہیں ہوگا۔"

نعمان نے کہا۔ "اگر آپ کا یہاں کوئی جان پہچان کرنے والا نہ ہوتا تو بھی آپ کو غریب الوطنی کا احساس، پریشان نہ کرتا اب ہمیں یہاں انسانی رشتے، خون کے رشتوں سے بھی زیادہ اہم محسوس ہوتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ ایسے وقت یہاں آئے ہیں، جب کہ ہمارا ہادی جس نے ہماری زندگی کے دھارے بدل دیئے تھے، ہم سے رخصت ہو چکا ہے۔ لیکن وہ روشنی جس میں ہم نے انسانیت کی نئی عظمتیں دیکھی ہیں، ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگی۔ یہ زمین جہاں قبیلوں اور نسلوں کے درمیان نفرت کی آگ کے پہاڑ کھڑے تھے، انسانی اخوت کا مرکز بن چکی ہے اور اب یہاں کسی انسان کو اپنی اجنبیت یا غریب الوطنی کا احساس پریشان نہیں کر سکتا۔"

عاصم نے کہا۔ "نعمان مجھے کل ہی ہادیٔ اسلام کی وفات کی خبر ملی تھی۔ اور راستے میں بعض لوگوں کی باتیں سُن کر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اسلام سے منحرف ہو جائیں گے۔ اپنی صدیوں کی زندگی پر جو قیود انہوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عظمت سے مرعوب ہو کر قبول کر لی تھیں، اب انہیں ناقابلِ برداشت محسوس ہوں گی۔ اور میں بذاتِ خود یہ محسوس کرتا ہوں کہ پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد حالات بدل چکے ہیں اور وہ عرب جو شراب، جوئے، سود، چوری، ڈاکہ زنی اور قتل و غارت اور ظلم و جور کو اپنی زندگی کے مقاصد میں شمار کرتے تھے، پوری شدت کے ساتھ اسلام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔"

نعمان نے جواب دیا۔ "یہ حالات ہمارے لئے غیر متوقع نہیں۔ ہم اُن قبائل کو جانتے ہیں جنہوں نے بحالتِ مجبوری اسلام قبول کیا تھا۔ ہم اُن جھوٹے نبیوں سے بھی بے خبر نہیں جو انہیں گمراہ کر رہے ہیں لیکن اسلام خدا کا دین ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس دین کے علمبردار ہر ابتلا اور ہر آزمائش سے سرخرو ہو کر نکلیں گے۔ اللہ کے دین کی راہ کا ہر کانٹا مسل دیا جائے گا اور صرف عرب کی حدود کے اندر ہی نہیں

بلکہ عرب کے باہر بھی جو طاقتیں اسلام سے متصادم ہوں گی، وہ اس سیلاب کے آگے تنکوں کے انبار ثابت ہوں گی۔"

عاصم نے پوچھا "کیا یہ درست ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات سے قبل یہاں سے ایک لشکر شام پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا؟"

"ہاں! میں اور سالم اس لشکر کے ساتھ جا رہے تھے۔ لیکن حضورؐ کی علالت اور وفات کے باعث ہم رک گئے ہیں۔"

عاصم بولا "اور اب شاید مقامی حالات اس لشکر کو ہمیشہ کے لئے شام پر چڑھائی کا ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیں۔"

"نہیں تمہارا قیاس غلط ہے۔ ہمارے امیر ابوبکر صدیقؓ کو جن لوگوں نے فوری خطرات کے پیش نظر شام کی طرف لشکر کی روانگی ملتوی کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ انہیں یہ جواب ملا ہے کہ اگر مجھے یہ یقین ہو کہ جنگل کے درندے مدینے میں داخل ہو کر مجھے اٹھا لے جائیں گے تو بھی اُس لشکر کو میں نہیں روک سکتا، جس کی روانگی کا حکم رسول اللہ نے دیا تھا۔"

عاصم نے پریشان ہو کر سوال کیا "لیکن تم اسے قرین مصلحت سمجھتے ہو کہ عرب کے باغی قبائل مدینے پر لشکر کشی کر دیں اور یہاں کی فوج شام کی طرف روانہ ہو جائے؟"

نعمان مسکرایا "ہمارے لئے رسول اللہ کا حکم ہی سب سے بڑی مصلحت اور دانائی ہے۔"

"اس فوج کا سپہ سالار کون ہے؟"

"ان کا نام اسامہ ہے اور وہ رسول اللہ کے غلام زید بن حارث کے بیٹے ہیں۔"

"تم یہ کہتے ہو کہ ایک غلام کا بیٹا، رومی سلطنت کے خلاف عربوں کی قیادت کر رہا ہے؟"

"نہیں بلکہ رسول اللہ کے ایک جاں نثار کو اسلام کے غازیوں کی امارت سونپی گئی ہے۔ اور اُس کو حضورؐ نے ہی اس خدمت کے لئے منتخب کیا تھا۔"

"کیا وہ بہت زیادہ تجربہ کار ہے؟"

"اُس کی عمر* بیس سال سے بھی کم ہے۔"

"اگر عربوں نے اُسے اپنا سپہ سالار تسلیم کر لیا ہے تو یہ یقیناً ایک معجزہ ہے۔"

"نہیں معجزہ یہ ہے کہ عرب مسلمان بن گئے ہیں۔"

عاصم نے کہا "میں اسلام کے متعلق بہت کچھ جاننا چاہتا ہوں لیکن پہلے مجھے اس سوال کا جواب دو کہ اوس اور خزرج واقعی ایک دوسرے کے دوست بن چکے ہیں؟"

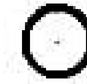
"ہاں! آج ہمیں یقین نہیں آتا کہ ہم کبھی ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ تمہارے روپوش ہونے سے چند دن بعد ہمارا آخری معرکہ ہوا تھا، اور ہماری رگوں میں جتنا فالتو خون تھا، وہ یثرب کی خاک میں جذب ہو گیا تھا۔ اُس کے بعد تمہارے جیسے چند آدمی ہدایت کی تلاش میں مکہ پہنچ گئے اور ہمیں اپنے مستقبل کے افق پر نئی روشنی دکھائی دینے لگی۔ پھر جب پیغمبرِ اسلام کے لئے مکہ کی زمین تنگ ہو گئی تھی تو اللہ نے اہلِ یثرب کو اُن کی میزبانی کا شرف عطا کیا اور یہاں خدا کی رحمتوں کی بارش ہونے لگی۔ اب ہم یثرب کو مدینۃ النبی کہتے ہیں۔ اب اس مقدس خاک میں صرف نیکیاں جنم لیتی ہیں۔ عاصم! جب تم یہاں سے نکلے تھے تو یہ کون کہہ سکتا تھا کہ اوس اور خزرج کسی دن ایک ہو جائیں گے۔ آپ کے جانے سے تین دن بعد عباد نے رات کے وقت میری اور سالم کی ملاقات کرائی تھی اور ہم سے یہ عہد لیا تھا کہ یثرب کے حالات خواہ کچھ ہو جائیں ہم ایک دوسرے پر تلوار نہیں اُٹھائیں گے۔ لیکن ہمیں اگلے دن ہی اس بات کا احساس ہو گیا کہ اوس اور خزرج کی جنگ ناگزیر ہے اور ہم یہاں رہتے ہوئے اپنے عہد پر قائم نہیں رہ سکیں گے۔ چنانچہ ایک رات ہم یہاں سے مدائن کی طرف بھاگ نکلے۔ وہاں تین سال گزارنے کے بعد ہم نے تاجروں کے ایک قافلے کے ساتھ یروشلم اور دمشق کی سیاحت کی۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید تم کہیں مل جاؤ۔ اس کے بعد ہم واپس آئے تو یہاں روئے زمین کی ساری نعمتیں ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔"

عاصم نے کرب انگیز لہجے میں کہا "اور میں اتنا بدنصیب تھا کہ انہیں دیکھ بھی نہ سکا۔"

---

*بعض کے مطابق عمر صرف سترہ سال تھی۔

"نہیں، عاصم! اگر تمہیں حق کی تلاش ہے تو تم بدنصیب نہیں ہو۔ آقا نے انسانیت کو نجات کا جو راستہ دکھایا ہے وہ کہکشاں سے زیادہ تابناک ہے۔ اب عصر کی نماز کا وقت جا رہا ہے، میں ابھی فارغ ہو کر تمہیں یہ بتاؤں گا کہ عرب میں کتنا عظیم انقلاب آچکا ہے۔"



تھوڑی دیر بعد عاصم اور فسطینہ دم بخود ہو کر نعمان کی تقریر سُن رہے تھے۔ وہ رسول اللہ کے جاں نثاروں پر اہلِ مکّہ کے مظالم بیان کر رہا تھا۔ وہ بدر، اُحد اور خندق کے معرکوں کے نقشے کھینچ رہا تھا۔ رسول اللہ کے معجزات بیان کر رہا تھا۔ اور اُن بشارتوں اور پیش گوئیوں کا ذکر کر رہا تھا جو پوری ہو چکی تھیں۔ وہ اُس قافلے کی سرگزشت سنا رہا تھا، جسے اہلِ مکّہ کے جبر و تشدد نے مدینے کی طرف ہجرت پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ مہاجرینِ مکّہ کے صبر و استقلال اور انصارِ مدینہ کے ایثار و خلوص کی داستانیں بیان کر رہا تھا۔ وہ شمعِ رسالت کے اُن پروانوں کی ارواح کو تشکر کے آنسو پیش کر رہا تھا جنہوں نے اپنے خون سے شجرِ اسلام کی آبیاری کی تھی، اور وہ انسانیت کے اُس عظیم ترین محسن کو درود اور سلام بھیج رہا تھا جس نے عرب کے ظلمتکدے میں ہدایت کے چراغ روشن کئے تھے۔ عاصم کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور جب نعمان نے اپنی تقریر ختم کی تو وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس کے دل سے ماضی کا سارا گرد و غبار دُھل چکا ہے۔

اُس نے پوچھا: "نعمان کیا یہ درست ہے کہ جب کسریٰ کی افواج شام پر یلغار کر رہی تھیں تو انہوں نے رومیوں کی فتح کی بشارت دی تھی؟"

"ہاں! یہ بشارت قرآنِ پاک میں موجود ہے۔ مجھے وہ آیات یاد ہیں، سنو!" نعمان نے یہ کہہ کر سورۂ روم سنا دی۔

عاصم نے کہا: "تمہیں معلوم ہے کہ اگر اُس زمانے میں خدا کا کوئی بندہ قسطنطنیہ پہنچ کر بھی اِس قسم کی پیش گوئی کرتا تو لوگ اُس کا مذاق اُڑاتے؟"

نعمان نے جواب دیا۔ اُس زمانے میں اہلِ مکّہ بھی اِس بشارت پر یقین کرنے والوں کا مذاق اُڑاتے

تھے۔ عاصم میں ایک عام آدمی ہوں۔ اور میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں رسول اللہ کی زندگی کے کسی پہلو پر بھی پوری روشنی ڈال سکتا ہوں۔ لیکن مدینے میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ پیغمبرِ علم کی محبت اور اطاعت کے لئے وقف تھا۔ یہ وہ آئینے ہیں جن میں تم اُن کے حسن و جمال کا عکس دیکھ سکو گے۔

"لیکن جب تم اُن کے ساتھ باتیں کرو گے تو وہ بھی یہی کہیں گے کہ اُن کی نگاہیں، نور کے ایک سمندر کی چند لہروں سے آگے نہیں جا سکیں۔"

"اور ان لوگوں کو اِس بات کا یقین ہے کہ وہ روم کی عظیم سلطنت کے ساتھ ٹکر لے سکتے ہیں؟"

"ہاں! انہیں یقین ہے کہ کسی دن قیصر اور کسریٰ کے تاج اُن کے پاؤں کے نیچے ہوں گے لیکن اگر یہ یقین نہ ہو تو بھی انہیں جہاد کا راستہ دکھانے کے لئے رسول اللہ کا حکم کافی ہے۔ مسلمانوں کے لئے زندگی کی سب سے بڑی سعادت یہ ہے کہ وہ خدا کی راہ میں شہید ہو جائے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ مسلمان فتح کی اُمید کے بغیر بھی لڑ سکتے ہیں؟"

"ہاں! اسلام کے غازیوں کو شہادت کا شوق، فتح اور شکست سے بے نیاز کر دیتا ہے۔"

نعمان نے کہا۔ "لیجئے سالم آگیا۔"

عاصم نے مُڑ کر دیکھا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سالم نے السلام علیکم کہا۔ اور پریشان سا ہو کر عاصم کی طرف دیکھنے لگا۔

سُعاد نے کہا۔ "اخی! آپ انہیں نہیں پہچانتے؟"

سالم کے تذبذب پر عاصم نے کہا۔ "سالم میں عاصم ہوں۔"

سالم چند ثانیے سکتے کے عالم میں کھڑا رہا اور پھر بے اختیار عاصم سے لپٹ گیا۔

کچھ دیر سالم سے گفتگو کے بعد عاصم نے نعمان کی طرف متوجہ ہو کر کہا "اب شام ہونے والی ہے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم تھوڑی دیر شہر میں گھوم آئیں۔"

نعمان نے کہا۔ چلئے لیکن آج آپ کو مدینے کی گلیاں خوشیوں سے خالی نظر آئیں گی۔ مسلمان ابھی رسول اللہ کا غم نہیں بھولے۔

عاصم میں نے ابھی تک ایک اہم فریضہ ادا نہیں کیا اور وہ یہ ہے کہ میں تمہیں اسلام کی دعوت دوں۔ مدینہ میں جن لوگوں کو آپ سے محبت ہے، اُن کے لئے اس سے بڑی خوشی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ تم اسلام قبول کر لو، ابھی جب میں رسولؐ اللہ کی زندگی کے واقعات بیان کر رہا تھا تو تمہارے آنسو اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ اسلام کی روشنی تمہارے دل سے دُور نہیں رہ سکتی۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم ایک مسلمان کی حیثیت سے مدینے کی گلیوں کا طواف کرو۔"

عاصم نے جواب دیا۔"نعمان میں تمہاری دعوت قبول کرتا ہوں۔ اگر خلیفہ مجھے مسلمان بنا سکتے ہیں تو مجھے ابھی اُن کے پاس لے چلو۔"

نعمان نے جواب دیا۔"اسلام قبول کرنے کے لئے آپ کو خلیفہ کے پاس جانے یا کوئی رسومات ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف زبان سے چند کلمات کافی ہیں۔"

فسطینہ نے سریانی میں اپنے شوہر سے کچھ کہا۔ اور وہ نعمان سے مخاطب ہو کر بولا۔"فسطینہ کو شکایت ہے کہ آپ نے اُسے قبولِ اسلام کی دعوت نہیں دی ہے۔"

نعمان نے جواب دیا۔"میں خوش قسمت ہوں کہ یہ سعادت میرے مقدر میں تھی، میں آپ دونوں کو کلمۂ توحید پڑھانے کے لئے تیار ہوں۔"

غروبِ آفتاب سے کچھ دیر بعد عاصم، نعمان اور سالم کے ساتھ گھر سے باہر نکلا تو اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کے دل سے ایک بوجھ اتر چکا ہے، اور اس کی روح ماضی کی زنجیروں سے آزاد ہو چکی ہے۔ نعمان اور سالم نے درود پڑھنا شروع کیا اور وہ اُن کے ساتھ شریک ہو گیا۔ پھر اُس کی آواز بلند ہوتی گئی اور پھر سسکیوں میں دب کر رہ گئی، اور اُس نے کہا۔"نعمان! مجھے اُن کی قبر پہ لے چلو۔"

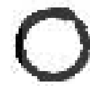
"ہم وہیں جا رہے ہیں عاصم!" اُس نے جواب دیا۔

راستے میں ایک نوجوان ملا اور اُس نے نعمان سے مخاطب ہو کر کہا۔"آپ نے خلیفۃ المسلمین کا اعلان سُن لیا؟"

"نہیں۔"

"انہوں نے حکم دیا ہے کہ شام تک تمام مجاہدین جرف[1] میں جمع ہو جائیں۔ اور پرسوں صبح وہاں سے کوچ کر دیں۔"

نعمان اور سالم کچھ دیر اس نوجوان کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد وہاں سے چل پڑے۔ جب وہ مسجدِ نبوی کے صحن میں داخل ہوئے تو وہاں لوگوں کا ہجوم تھا اور وہ باری باری اُس حجرے کے اندر داخل ہو رہے تھے جہاں رسولؐ اللہ دفن تھے۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد عاصم اور اُس کے ساتھیوں کی باری آئی اور وہ اندر داخل ہوئے، یہ حجرہ چراغوں سے روشن تھا اور لوگ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہے تھے۔ نعمان اور سالم کی تقلید میں عاصم نے بھی ہاتھ اٹھائے، لیکن کچھ دیر دُعا کے لئے کوئی موزوں الفاظ اُس کے ہونٹوں پر نہ آ سکے۔ بالآخر اُس نے کہا۔"میرے آقا! تیری قبر پہ خدا کی رحمتوں کی بارش ہو۔ میرے آقا میں بہت دیر سے آیا۔ کاش! میں تجھے ایک بار دیکھ سکتا۔ لیکن اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود، میں تیرے اللہ کی رحمت کا طلبگار ہوں۔" پھر اُس کی آواز بیٹھ گئی۔ اور اُس کی آنکھوں سے آنسو امڈ آئے۔ اور یہ آنسو ایک فرد کی بجائے اُن لاتعداد انسانوں کے جذبۂ تشکر کی ترجمانی کر رہے تھے جنہیں رحمۃ للعالمین نے زندگی کی حقیقی مسرتوں سے آشنا کیا تھا۔



تیسرے دن عاصم مدینہ سے ایک کوس دور جرف کے مقام پر اُس لشکر کی روانگی کا روح پرور نظارہ دیکھ رہا تھا، جسے توحید کا پرچم عرب کی سرحدوں سے آگے لے جانے کی سعادت عطا ہوئی تھی۔ عبداللہ، اپنے باپ نعمان اور اپنے ماموں سالم کو الوداع کہنے کے لئے اُس کے ساتھ آیا تھا اور وہ عاصم کے گھوڑے کی باگ تھامے ایک طرف کھڑا تھا۔

اِس لشکر میں قبائل عرب کے وہ رؤسا موجود تھے جو اسلام قبول کرنے سے قبل ادنیٰ اور اعلیٰ کا امتیاز قائم رکھنا اپنی زندگی کا اوّلین مقصد سمجھتے تھے اور جو صرف اپنے قبیلوں کی برتری کا ثبوت دینے کے لئے

---

[1] مدینہ سے ایک کوس دُور وہ مقام جہاں شام کی طرف کوچ کرنے والی فوج نے پڑاؤ ڈالا تھا۔

ہمیشہ خون کی ندیاں بہانے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اس لشکر میں وہ جلیل القدر صحابی موجود تھے جنہیں اپنی بزرگی اور پاکیزگی کے علاوہ خاندانی رشتوں کی بدولت رسول اللہ کی قربت کا فخر حاصل تھا۔ اور یہاں اُن اولوالعزم بہادر اور تجربہ کار سپاہیوں کی بھی کمی نہ تھی۔ جو ہر آزمائش اور ہر امتحان میں پورے اتر چکے تھے۔ لیکن اس لشکر کی قیادت ایک ایسے نوجوان کو سونپی گئی تھی، جس کی سب سے بڑی متاع رسول اللہ کی محبت تھی اور جس کے باپ کو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں انسانیت کی عظمتیں نصیب ہوئی تھیں۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ گھوڑے پر سوار تھے اور حضرت ابوبکرؓ نیچے کھڑے انہیں ہدایات دے رہے تھے۔ کسی کو اعتراض کی مجال نہ تھی، کسی کو یہ کہنے کا یارا نہ تھا کہ انتہائی معزز صحابیوں، آزمودہ کار سالاروں، اور انتہائی بااثر قبائلی سرداروں کی موجودگی میں اتنی اہم مہم کی قیادت اُسامہ کو کیوں سونپی گئی ہے۔ اسلام آقا اور غلام کا امتیاز مٹا چکا تھا۔ اللہ کے دین کی روشنی زمانہ جاہلیت کی تمام عصبیتوں کو شکست دے چکی تھی۔ اس سے قبل جن بزرگوں نے گردو پیش کے حالات سے پریشان ہو کر اسامہؓ کی بجائے کسی زیادہ معمر اور تجربہ کار آدمی کو یہ مہم سونپنے کی تجویز پیش کی تھی، انہیں مطمئن کرنے کے لئے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ جواب کافی تھا کہ اسامہؓ کو رسول اللہ نے منتخب کیا تھا اور بڑے سے بڑا خطرہ بھی مجھے اس فیصلہ میں تبدیلی پر آمادہ نہیں کر سکتا۔

پھر جب اسلام کا یہ لشکر روانہ ہوا تو اسامہ بن زید گھوڑے پر سوار تھے اور ابوبکر صدیقؓ ان کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے پیدل چل رہے تھے۔

حضرت اسامہؓ خلیفۂ اوّل کے مقام سے بے خبر نہ تھے۔ انہوں نے ملتجی ہو کر کہا "اے خلیفۂ رسول اللہ مجھے شرمسار نہ کیجئے، آپ گھوڑے پر سوار ہو جائیے، ورنہ میں بھی اتر پڑتا ہوں۔"

اور انہوں نے فرمایا "نہیں اُسامہؓ، مجھے تھوڑی دور اللہ کی راہ میں اپنے پاؤں غبار آلود کرنے سے منع نہ کرو۔"

جب لشکر تھوڑی دُور چلا گیا تو عاصم نے عبداللہ کے ہاتھ سے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا "عبداللہ میں تمہارے باپ اور ماموں کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

عبداللہ نے کہا "لیکن آپ تو صرف انہیں الوداع کہنے آئے تھے۔"

عاصم نے گھوڑے پر سوار ہو کر جواب دیا "سعاد سے کہہ دینا کہ یونس کی امی میری واپسی تک تمہارے گھر رہے گی۔"

آن کی آن میں وہ اُس قافلے کے ساتھ شامل ہو چکا تھا جس کی راہ کے غبار کو کہکشاں کی دلکشی اور تابندگی عطا ہونے والی تھی۔ راہِ حق کے یہ مسافر اُن مجاہدوں کے پیش رو تھے، جن کے گھوڑوں کی ٹاپ قیصر اور کسریٰ کے ایوانوں تک سنائی دینے والی تھی۔ حال اُن کے حوصلوں اور ولولوں سے لبریز تھا۔ اور مستقبل کی فتوحات یرموک اجنادین اور قادسیہ کے میدانوں میں اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور چند معزز صحابی جنہیں انہوں نے مدینہ کی حفاظت کے لئے روک لیا تھا، کچھ دور اسامہ بن زیدؓ کا ساتھ دینے کے بعد اُن بچوں اور بوڑھوں کے درمیان کھڑے تھے جو اپنے عزیزوں کو رخصت کرنے آئے تھے۔ یہ لوگ اُن خطرات سے بے خبر نہ تھے جو رسول اکرمؐ کے وصال کے بعد مدینہ کو اسلام سے انحراف کا راستہ اختیار کرنے والے قبائل کی طرف سے پیش آنے والے تھے۔ لیکن اُن کے چہروں پر خوف و ہراس کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ اس بات پر مطمئن اور مسرور تھے کہ اُن کے آقا کے آخری حکم کی تعمیل ہو رہی ہے۔ اُن کے ہونٹوں پر غازیانِ اسلام کی فتح اور نصرت کی دعائیں تھیں اور صدیق اکبرؓ سے زیادہ یہ کون جانتا تھا کہ یہ دعائیں قبول ہونے والی ہیں۔ وہ پورے اطمینان اور یقین کے ساتھ اُس قافلے کی آخری جھلک دیکھ رہے تھے۔ جس کی راہ کے غبار میں قیصر و کسریٰ کی عظمتیں گم ہونے والی تھیں۔ ملتِ اسلام کے کمسن بیٹوں کو جو ابھی تک تلواریں اٹھانے کے قابل نہیں ہوئے تھے۔ اُن کی نگاہیں بشارت دے رہی تھیں کہ غازیانِ اسلام اُس عظیم لشکر کا دستہ ہراول ہیں جسے قدرت نے عجم میں جہالت اور ظلم کے جھنڈے سرنگوں کرنے کے لئے منتخب کیا ہے۔ جب وہ شام کی مہم سے واپس آئیں گے تو تم مسرت کے نعروں کے ساتھ اُن کا خیر مقدم کرو گے اور پھر جب تمہاری باری آئے گی تو تم اللہ کے دین کا پرچم اُن سرحدوں سے آگے لے جاؤ گے جہاں سائرس اور سکندر کے قدم رُک گئے تھے۔ لیکن وہ ظاہر بین جو نتائج کو صرف اسباب کی روشنی میں دیکھ سکتے تھے جنہوں نے کسریٰ پرویز کی فتوحات کے دور میں رومیوں کے دوبارہ غالب آنے کے متعلق قرآن حکیم کی آیات کا مذاق اڑایا تھا جنہوں نے پیغمبرِ اسلام کی وفات کی خبر سنتے ہی حال اور مستقبل کی روشنی سے

منہ پھیر کر ماضی کی بھیانک تاریکیوں سے رشتہ جوڑ لیا تھا۔ آج بھی یہ سمجھنے کے لئے تیار نہ تھے کہ انہوں نے آس پاس کے ٹیلوں کی اوٹ سے جس لشکر کی روانگی کا منظر دیکھا ہے۔ وہ روم کی عظیم قوت کے ساتھ ٹکر لے سکتا ہے۔ انہیں اگر کوئی اطمینان تھا تو وہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے شام پر چڑھائی کے شوق میں مدینہ کو اُن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔

لیکن چند دن بعد مدینہ کو تاخت و تاراج کرنے کی مہم میں ناکامی اور شام کی مہم سے اسامہؓ کی، کامیاب مراجعت کے باعث اُن کے حوصلے ٹوٹ چکے تھے۔ اور وہ اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ فرزندانِ آدم کی تاریخ میں معجزات کا دور ابھی ختم نہیں ہُوا۔

